سرما ۱۹۹۰

آج

ترتیب : اجمل کمال

نجیب محفوظ   لیوتالستائی

کیم مونرو   مظفر علی سیّد

فہمیدہ ریاض   عذرا عباس   احمد فواد

محمد خالد اختر   اکرام اللہ

آج کی کتابیں

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

آج دسمبر ۱۹۸۹

مینیجنگ ایڈیٹر، پبلشر
زینت حسام

اہتمام
آج کی کتابیں
بی ۱۴۰ سیکٹر ۱۱ بی نارتھ کراچی ٹاؤن شپ کراچی ۳۶

کمپوزنگ
پبلشرز یونائیٹڈ
۸۷ دارالامان کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی

طباعت
ابنِ حسن پرنٹنگ پریس
ہاکی اسٹیڈیم کراچی

تقسیم کار
مکتبۂ دانیال
وکٹوریہ چیمبرز نمبر ۲ عبداللہ ہارون روڈ کراچی

ترتیب

۷
نجیب محفوظ
ملاقات

۱۸
لیو تالستائی
پیالا

۲۴
کیم مونزو
جہاں گرد

۲۹
مظفر علی سید
اردو ادب کی صورتِ حال

rekhta
Scanned with CamScanner

٣٩
فہمیدہ ریاض
زوجین

٤٢
عذرا عباس
نظمیں

٤٩
احمد فواد
نظموں کے منتخب حصّے

٦٥
محمد خالد اختر
ہندوستان کی سرسری تاریخ ١٠

انتخاب

تعارف

٨١
اکرام اللہ
سوا نیزے پر سورج

ڈرائنگ
جیلنت

مصر کے مشہور اور متنازعہ ادیب نجیب محفوظ، جنھیں ۱۹۸۸ میں ادب کا نوبیل انعام دیا گیا، ۱۹۱۱ میں جمالیہ میں پیدا ہوے، جہاں کی خوشبوؤں اور آوازوں نے ان کی بیش تر افسانوی تحریروں کے محلِ وقوع کو ایک حقیقی روپ بخشا۔ انھوں نے فلسفے کی تعلیم حاصل کی، لیکن یونیورسٹی کا استاد بننے سے اس بنا پر احتراز کیا کہ وہ اپنی بنیادی شناخت ادب ہی کو رکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے یونیورسٹی کی انتظامیہ، وزارتِ مذہبی امور اور وزارتِ ثقافت میں مختلف عہدوں پر خدمات سر انجام دیں اور اپنی فرصت کا تمام تر وقت لکھنے میں صرف کیا۔

۱۹۵۲ کے مصری انقلاب سے پہلے وہ اپنی مشہور trilogy مکمل کر چکے تھے۔ پانچ برس تک انھوں نے کچھ نہ لکھا، جس کی وجہ ان کے اپنے الفاظ میں یہ تھی کہ "وہ دنیا جسے بیان کرنا میں نے اپنا وظیفہ بنا لیا تھا، وہ ناپید ہو گئی تھی"۔ ۱۹۵۷ میں انھوں نے اپنا سب سے مشہور ناول "جبلاوی کے بیٹے" لکھنا شروع کیا جو قاہرہ کے نیم سرکاری اخبار "الاھرام" میں قسط وار شائع ہوا۔ اس اشاعت نے ایک سخت تنازعے کی شکل اختیار کرلی، اور اخبار کے مدیر کو اس ناول کی اشاعت جاری رکھنے کے لیے صدر ناصر سے اپنے ذاتی تعلقات کو استعمال کرنا پڑا۔ کسی مصری پبلشر کو اسے کتابی صورت میں شائع کرنے کی ہمت نہ ہوئی، اور یہ ناول پہلی بار ۱۹۶۷ میں لبنان سے شائع ہوا۔

فکشن کی رمزیت اور تہہ داری نجیب محفوظ کے فن کی نمایاں خصوصیت ہے، جس کی بنا پر ان کی کہانیاں، جو تبدیلی کے عمل سے دوچار مصری معاشرے کی تصویریں ہیں، ایک آفاقی تناظر اختیار کر لیتی ہیں۔ یہ خصوصیت نجیب محفوظ کی کہانی "ملاقات" میں بھی موجود ہے، جس کا ترجمہ آپ اگلے صفحات میں ملاحظہ کریں گے۔ یہ کہانی ۱۹۶۹ میں شائع ہونے والے مجموعے میں شامل ہے اور اس لحاظ سے نجیب محفوظ کی نمائندہ تحریر ہے کہ اس میں ایک حقیقت نگار بیانیے کی سطح کے نیچے فکشن کی وہی رمزیت اور تہہ داری موجود ہے جو ان کے فن کی پہچان ہے۔

اجمل کمال

نجیب محفوظ

ملاقات

وہ بےحس و حرکت اپنے بستر پر پڑی تھی۔ اپنی آنکھوں، پپوٹوں اور ایک ہاتھ کے سوا بدن کے کسی بھی حصّے کو حرکت نہ دے سکتی تھی۔ اپنا ہاتھ بھی بس وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد سینے تک اٹھا سکتی تھی۔ بیماری نے اس میں سے قوّت گویا نچوڑ ڈالی تھی۔ اس کا گوشت گھل چکا تھا، اس کی زرد کھال جس کے رنگ میں نیلاہٹ جھلکنے لگی تھی، اس کی باہر نکلی ہوئی ہڈیوں پر منڈھی رہ گئی تھی۔ وہ یا تو کسی خالی نقطے کو بےمعنی نظروں سے تکتی رہتی یا اپنی آنکھیں بند کیے پڑی رہتی۔ اس کی بینائی، بہت ہوا تو، اس کے کمرے کی چاردیواری تک محدود رہ گئی تھی۔

عیون نے بچے کی سی باریک، کمزور آواز میں پکارا،

"عدلیہ!"

لیکن عدلیہ کو اس کی آواز سنائی نہ دی۔ کم از کم وہ ظاہر یہی کرے گی کہ اس نے نہیں سنا۔ بہانہ یہ ہو گا کہ عیون کی آواز بہت مدھم تھی یا باورچی خانہ بہت دور ہے یا وہاں چولھے کا شور بہت تھا۔ عیون نہ اپنی آواز کو اس سے زیادہ بلند کر سکتی تھی نہ اسے پکارے بغیر رہنا اس کے لیے ممکن تھا۔ اس نے پھر آواز دی،

"عدلیہ!"

عیون کو پھر اسے ملامت کرتے ہوے خوف محسوس ہو گا۔ وہ عدلیہ کے رحم و کرم پر تھی، مکمل طور پر اس کے رحم و کرم پر۔ وہ عدلیہ کو راضی رکھنے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتی تھی۔ وہ اسے عمدہ تنخواہ، کپڑے اور کھانا دیتی۔ اس کا گھر عدلیہ ہی سنبھالتی تھی۔ وہ اس گھر کی حقیقی مالکہ بن چکی تھی۔ عیون اس بارے میں کر ہی کیا سکتی تھی؟ اگر کسی روز عدلیہ اس کی ملازمت چھوڑنے کا فیصلہ کر لیتی تو عیون کو ہولناک تنہائی اور موت کی خوراک بن جانا پڑتا۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ انتہائی ضرورت کے سوا اس کو ہرگز تکلیف نہ دے،

Scanned with CamScanner

لیکن اس کے بس میں کیا تھا؟ زندگی کی ضرورتیں تو آخری سانس تک چلتی رہیں گی۔

اس نے اپنی ساتھ چھوڑتی قوّت کو مجتمع کر کے ایک بار پھر پکارا،

"عدلیہ!"

غصّہ اس کے بڈیالے سینے میں اُبھرنے لگا، لیکن اس نے اس کے ہیجان میں بہہ جانے سے خود کو روک لیا۔ آخر عدلیہ کو کام بھی تو کتنا کرنا پڑتا ہے! صفائی کرنا، کھانا پکانا اور سودا سلف لانا۔ اس نے عیون کے ہاتھ پیروں اور اس کی حسّیات کی جگہ سنبھال رکھی تھی۔ عیون کے لیے وہ سبھی کچھ تھی، وہی کھانے پینے میں اس کی مدد کرتی، اس کا منہ دھلاتی، اسے بٹھاتی اور دوبارہ بستر پر لٹاتی اور اس کی بےچینی دور کرنے کے لیے اسے کروٹ بدلواتی۔

اس نے اپنی شکایت آمیز، حسرتناک آواز کو ذرا سا بلند کیا،

"عدلیہ!"

اسے بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ پھر عدلیہ کمرے کے دروازے پر نمودار ہوئی۔ اس کے بےحس چہرے پر ناگواری کی ایک مستقل چھاپ تھی۔ اس نے ذرا تیکھی آواز میں پوچھا،

"مجھے بلایا، خانم؟"

"آواز دے دے کر میرا گلا بیٹھ گیا، عدلیہ۔"

وہ بستر کی طرف بڑھی، اور عیون نے کہا،

"مجھے ایک سگریٹ دو۔"

عدلیہ نے بستر کے سرھانے کی میز پر رکھے ڈبّے میں سے ایک سگریٹ نکالا، اسے سلگایا اور خانم کے ہونٹوں میں لگا دیا۔ بولی،

"آپ جانتی ہیں سگریٹ پینا آپ کے لیے اچھا نہیں ہے۔"

پھر وہ کمرے سے چلی گئی۔

اگر کسی روز عدلیہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو یہ عیون کے لیے سزائے موت کے برابر ہو گا۔ وہ کسی اور پر بھروسا نہ کر سکتی تھی۔ اس کے بھانجے اور بھانجیاں اس کی، اپنی خالہ عیون کی، کوئی پروا نہ کرتے تھے۔ وہ توجّہ اور یاد گیری سے محروم، زندگی کی باقی ماندہ رمق سے خوف اور مایوسی کے ساتھ چمٹی ہوئی پڑی تھی اور موت کی آرزو مند تھی۔ اس کے اکلوتے بیٹے کے ایک خونریز مظاہرے میں مارے جانے نے اس کے دل کو، بیماری سے بھی پہلے، چیر ڈالا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ اگرچہ اس کی اکلوتی اولاد سیاست کی بھینٹ چڑھ گئی تھی، لیکن اسے سیاست کی کچھ بھی سمجھ نہ تھی اور نہ وہ اس سے ذرا بھی متاثر ہوتی تھی۔ بیٹے کی ہلاکت کے ایک ہی سال بعد اُس کا باپ چل بسا تھا۔ اور اب عیون کے اندوہ کی یادیں اس کی بیماری کی اذیّت اور تنہائی کے ہولناک سایوں میں گھل مل گئی تھیں۔

بُثینہ، اس کی مرحوم بہن کی بیٹی، پچھلی بار عید پر اس سے ملنے آئی تھی۔ وہ ایک پرائمری اسکول کی پرنسپل تھی اور صرف وہی تھی جسے تہواروں کے موقعے پر عیون کی یاد آ جاتی تھی۔ وہ اپنے ساتھ ایک گلدستہ اور مٹھائی کا ڈبا لے کر آئی تھی۔ وہ یہیں اس کے بستر کے قریب ایک

کرسی پر بیٹھی تھی۔ عیون کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ بولی،

"شکریہ بُثینہ۔ تم کیسی ہو؟ سب لوگ کیسے ہیں؟ تم سب کو دیکھنے کو کتنا دل چاہتا ہے، مگر مجھے پوچھتا ہی کون ہے!"

بُثینہ معذرت خواہانہ انداز میں مسکرائی اور بولی،

"زندگی مصروفیتوں سے بھری پڑی ہے خالہ!"

"تم لوگوں کے سوا میرا کون ہے؟ آخر مُردوں کو بھی کوئی نہ کوئی یاد رکھتا ہے۔"

"تمھارا مجھے اکثر خیال آتا ہے خالہ، مگر کیا کروں۔ مصروفیتوں سے وقت ہی نہیں ملتا۔"

"سب لوگ مجھے بھول گئے ہیں بُثینہ!"

بُثینہ نے بالآخر خاموشی میں پناہ لی۔ عیون نے کہا،

"میں آخر تم لوگوں کی خالہ ہوں۔ تمھاری ماں کی واحد بہن جو زندہ رہ گئی ہے۔ اگر عدلیہ مجھے چھوڑ جائے تو میں یہاں پڑی پڑی بھوکی مر جاؤں۔"

اس نے ایک گہری دردناک آہ کی آواز سنی، اور بولتی رہی،

"ہم تینوں بہنیں، تمھاری ماں، بڑی خالہ اور میں، کتنے خوش رہا کرتے تھے!"

"خدا ان دونوں پر رحمت کرے!"

"میں ان دونوں سے چھوٹی تھی۔ میری خوشیوں کی تو کوئی حد ہی نہ تھی۔"

"خدا کرے تم جلد صحت یاب ہو جاؤ خالہ!"

"تمھاری دعا قبول نہیں ہوگی بُثینہ! میں اکیلی رہ گئی ہوں۔ مجھے سب نے چھوڑ دیا ہے۔ میری پنشن بھی میرا پڑوسی لا کر دیتا ہے۔"

اس نے اپنے کمزور نیلے پڑتے ہوئے ہاتھ سے اپنی آنکھیں پونچھیں، اور بولی،

"میں بہت خوف زدہ ہوں بُثینہ! مجھے اس دن سے بہت ڈر لگتا ہے جب عدلیہ مجھے چھوڑ کر چلی جائے گی۔"

"ایسا نہیں ہوگا خالہ! اُسے اِس جیسا گھر اور کہاں ملے گا؟"

"اسے میرا بہت کام کرنا پڑتا ہے۔ میں اس کی طرف سے بہت فکر مند رہتی ہوں۔"

"تمھارا پورا گھر اور سارے پیسے اس کے قبضے میں ہیں۔ بھلا وہ تمھیں چھوڑ کر کیوں جانے لگی؟"

"پھر بھی میں خوف زدہ ہوں۔ مجھے ہر وقت فکر لگی رہتی ہے۔ ہر وقت شک گھیرے رہتا ہے۔ میں اُس سے بھی اتنی ہی خوف زدہ ہوں جتنی اس کے چلے جانے سے۔"

بُثینہ چپ ہو گئی۔ یا تو اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں رہا تھا، یا پھر وہ ایک جیسے گھسے پٹے جملے دہراتے رہنے سے اکتا گئی تھی۔ عیون نے کہا،

"مجھے معاف کر دو بُثینہ! میرے پاس باتیں ختم ہو گئی ہیں۔ پھر یہ ٹھیک بات نہیں کہ میں تمھیں اپنی فکروں سے مستقل پریشان کیے جاؤں۔ صرف تمھیں تو ہو جسے میرا خیال رہتا ہے۔"

اس کا لہجہ بدل گیا۔ اس نے اپنا شکایتی انداز ترک کر دیا، اور ہمدردانہ لہجے میں پوچھا،

"اب تم بتاؤ، تمھاری اپنے شوہر سے کیسی نبھ رہی ہے؟"

Scanned with CamScanner

بُثینہ نے ایک گہری سانس لی اور مختصر سا جواب دیا،
"بس ٹھیک ہی ہے۔"
"مگر یہ کیسے ممکن ہے، تم تو اتنی بے مثال لڑکی ہو۔"
پھر عیون کے خشک، غمناک ہونٹوں پر ایک تھکی ہوئی مسکراہٹ نمودار ہوئی، اور وہ بولی،
"تم اتنی خوب صورت ہو بُثینہ! لوگ کہتے ہیں تم ایسی ہو جیسی میں اپنی جوانی میں تھی۔ تم پورے خاندان میں سب سے زیادہ میری ہم شکل ہو۔"
بُثینہ نے اثبات میں سر ہلایا اور وہ بھی مسکرائی۔
"جب میں گلی میں نکلتی تھی یا دریچے میں کھڑی ہوتی تھی، تو ساری آنکھیں مجھ پر مرکوز ہوجاتی تھیں۔"
بُثینہ ہنسی اور عیون کی طرف درد مندی سے دیکھنے لگی۔
"تم کہتی ہو کہ تمھارے اپنے شوہر سے تعلقات بس ٹھیک ہی ہیں۔ کیا اسے احساس نہیں کہ خدا نے اسے کتنی بڑی نعمت سے نوازا ہے؟"
"دنیا کا یہی دستور ہے خالہ۔"
"لعنت ہو ایسی دنیا پر۔"
"دنیا کا کیا بھروسا ہے خالہ۔"

عدلیہ کھانے کے برتن اٹھائے داخل ہوئی۔ اس نے عیون کو اٹھا کر تکیے کے سہارے بٹھا دیا اور اسے کھانا کھلانے لگی۔
اس کا دل جیتنے کی کوشش میں عیون نے کہا،
"کھانا بہت اچھا پکا ہے عدلیہ۔"
عدلیہ نے مسکرائی نہ اس کا شکریہ ادا کیا، جیسے اس نے عیون کی بات سنی ہی نہ ہو۔ کمزور اور بےبس شخص کی تعریف بھی بےاثر ہوتی ہے۔
"کیا ہوا ہے عدلیہ؟"
"میں اپنی بیٹی کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔"
"خدا اسے خوش رکھے۔ اسے کیا ہوا؟"
"وہ اپنے مرد کے ہاتھوں بڑی مصیبت میں ہے۔"
"کیوں؟ آخر وہ اپنے سات بچوں کی ماں سے ایسا سلوک کیسے کر سکتا ہے؟"
"آپ اسے نہیں جانتیں، خانم۔"
"تم اپنی بیٹی کو سمجھاؤ۔ اسے کہو کہ صبر سے کام لے۔"
"اگر اسے طلاق ہو گئی تو پھر کیا ہو گا؟"
ہاں واقعی، پھر کیا ہو گا؟ اگر عدلیہ اپنی بیٹی اور اس کی اولاد کو اس گھر میں لے آئی تو؟ عیون اس پر اعترا ض بھی کیسے کر سکتی ہے؟ وہ تو پوری طرح عدلیہ کے رحم و کرم پر ہے۔ یہ مکان اتنا کشادہ نہیں، اس پورے خاندان کے آ جانے سے تو بالکل بازار بن کر رہ جائے گا۔ اتنے شور

و غل اور ہنگامے میں اس کا کیا حشر ہو گا؟ اور پھر ان سب کے کھانے اور کپڑے کا خرچ وہ کیسے برداشت کر سکے گی؟
یہ تمھارے لیے ایک نئی تشویش ہے عیون! شیخ طہ نے تمھاری شادی پر تمھیں دعا دیتے ہوئے کہا تھا "خدا تمھیں عزت دے،اور تمھاری قسمت اچھی ہو۔" تمھاری ماں تم پر کس قدر ناز کرتی تھی۔ تمھاری شادی شدہ زندگی کتنے خوشگوار انداز سے شروع ہوئی تھی۔ تمھارا شوہر ایک معزّز خاندان سے تعلق رکھنے والا جج تھا۔ اس نے تمھیں ایک روز کوسموگراف سنیما کے باکس میں دیکھ لیا تھا اور تم پر مر مٹا تھا۔ تم ایک محبوب بیوی اور ایک مسرور ماں تھیں۔ تمھارا شوہر، تمھارے حسن پر نازاں، تمھارا ہاتھ تھام کر اوپیرا لے جایا کرتا تھا۔ وہاں ایک بار جب ایک پاشا نے تم سے بےتکلف ہونے کی کوشش کی تو فساد ہوتے ہوتے بچا تھا۔ لیکن تمھاری زندگی کی کہانی کا انجام یہ ہے، یہ بسترِ مرگ، جہاں تم اس بےحس اور حقیر عورت کے رحم و کرم پر پڑی ہو جو تمھیں ایک مسکراہٹ تک سے محروم رکھتی ہے۔
دروازے کی گھنٹی بجی۔ عیون کی آنکھیں اُمید سے جھلملائیں۔ کیا کوئی ملنے آیا ہے؟
"کون ہے، عدلیہ؟"
"پلمبر آیا ہے، خانم۔"
پھر وہی پلمبر! یہ ہمیشہ یہیں موجود رہتا ہے! باورچی خانے یا غسل خانے یا کسی پائپ کی مرمت کے لیے آیا ہو گا۔ نتائج سے خوف زدہ ہو کر وہ کبھی عدلیہ سے پوچھنے تک کی ہمت نہ کرتی تھی، اعترا ض کا تو سوال ہی کیا تھا۔ پلمبر جب اس کی مرضی ہوتی، یا جب وہ حرّافہ اسے بلا بھیجتی، آ موجود ہوتا۔
عدلیہ نے عیون کے کمرے کا دروازہ بھیڑ دیا تاکہ وہ پلمبر کو نہ دیکھ سکے۔ عیون کو بہت دنوں سے اس پر شک تھا، مگر وہ کیا کر سکتی تھی؟ اس کے گھر میں یہ سب کچھ ہوتا، اس کے کمرے کے دروازے کے باہر، جسے اس کی اجازت کے بغیر، بلکہ اس کی مرضی کے خلاف، بند کر دیا جاتا، اور یہ سب اس کے تحفّظ کے نام پر! وہ بےبس اور مجبور تھی۔ اگر اس شخص کو اس سے زیادہ کا لالچ ہوتا، یا وہ اسے اپنے راستے کی رکاوٹ محسوس کرتا، اگر کوئی شیطانی خیال اس کے ذہن میں آجاتا، تو عیون کی حفاظت کون کر سکتا تھا؟ وہ کان لگا کر غور سے سننے لگی۔ وہ بےحد مضطرب تھی۔ اس کا خون کھول رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کے مرحوم بیٹے کو بھی اُس بےرحم صورتِ حال کا سامنا کرتے ہوئے ایسی ہی بےبسی محسوس ہوئی ہو گی جس نے اسے عالمِ شباب میں ہلاک کر ڈالا تھا۔ لیکن وہ تو نیم مردہ اور بستر کی قیدی تھی۔
عدلیہ نے دروازہ کھول دیا، اور بولی،
"چلا گیا۔"
کیا اس نے ضرورت سے زیادہ وقت نہیں لگایا؟ اس کا ذکر کیے بغیر عیون نے پوچھا،
"کیا کیا اس نے؟"
"باورچی خانے کا پائپ ٹھیک کرنا تھا۔"
اس نے خود پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا،

Scanned with CamScanner

"لیکن باورچی خانے کا پائپ تو ۔"

عدلیہ تیزی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی!

"بہت پرانا ہو گیا ہے۔ بار بار مرمت کرنی پڑتی ہے۔"

ہاں اس کی بار بار مرمت کرنی پڑتی ہے! چاہے اس کی جگہ نیا پائپ ہی کیوں نہ لگا دیا جائے، پلمبر کی آمدورفت کی ضرورت ہمیشہ رہے گی۔ ٹھیک ہے، آیا کرے، جب اس کی مرضی ہو، یا جب عدلیہ چاہے۔ اسے تو اس صورتِ حال کو برداشت کرنا ہی ہو گا، کیونکہ اس کی آنکھوں، ہاتھ پیروں اور تمام حسّیات کی جگہ آخر عدلیہ ہی نے تو سنبھال رکھی ہے۔ اس گھر میں عدلیہ کا کام بھی تو سخت اور تھکا دینے والا ہے۔ پھر بھی یہ صورتِ حال عیون کی برداشت سے باہر رہے گی، اور اس کا نتیجہ بےخوابی کی شکل میں نکلتا رہے گا۔

تب ایک دن، ایک اجنبی نے دروازے پر دستک دی۔ عدلیہ نے آکر اسے بتایا؛

"خانم، ایک اندھا آدمی آیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ پرانے دنوں میں آپ اسے جانتی تھیں ۔"

اس کے مزید بولنے سے پہلے ہی، باہر اجنبی کے زور سے بولنے کی آواز سنائی دی؛

"شیخ طٰہٰ الشّریف، خانم عیون"

یہ آواز! یہ نام ! اس نے اپنی دم توڑتی ہوئی یادداشت کو مدد کے لیے پکارا۔ اس کا دل بےقراری سے چونک اٹھا۔ پھر یادوں نے تازہ معطّر ہوا کے جھونکوں کی طرح اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ شادمانی کی ایک لہر سی اس کے وجود میں دوڑ گئی۔

"آئیے، آ جائیے شیخ طٰہٰ! عدلیہ ! انھیں یہاں لے آؤ!"

وہ عدلیہ کے سہارے، چھڑی کے سرے سے راستا ٹٹولتا ہوا اس کے بستر کے پاس آیا۔ اس کا عمامہ ڈھیلا ہو کر کھل گیا تھا اور اس کی بلند پیشانی نمایاں ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ اس کی پشت کہن سالی سے جھکی ہوئی تھی۔ اس کی اترے ہوئے رنگ والی پھٹی پرانی عبا نے اس کے نحیف جسم کو ڈھانپ رکھا تھا۔ جب اسے عیون کے سرہانے بٹھا دیا گیا تو وہ اس سے مخاطب ہوئی؛

یہ رہا میرا ہاتھ، شیخ طٰہٰ، لیکن اسے زور سے مت دبانا، یہ بہت کمزور ہے۔"

اس نے نہایت نرمی اور شفقت سے مصافحہ کیا، اور کہا؛

"خدا تمھیں جلد شفایاب کرے، خانم عیون"

"خدا کا شکر ہے جس نے پھر تمھاری صورت دکھائی۔ پچھلی بار ہماری ملاقات کب ہوئی تھی؟"

اس نے اپنا سر تاسّف سے ہلایا، اور بولا؛

"کتنا زمانہ گزر گیا!"

"وہ کتنے اچھے دن تھے، شیخ طٰہٰ"

"خدا تمھیں ہمیشہ اچھے دن دیکھنا نصیب کرے"

"مگر کیسے؟ میں تو یہاں بسترِ مرگ پر پڑی ہوں، اور تنہا ہوں۔"

اس نے انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کیا، اور بولا؛

"وہ رحم کرنے والا ہے۔"

"تمھیں میرا پتا کیسے معلوم ہوا؟"

"میں پرانی حویلی کے چوکیدار سے ملا تھا، چچا آدم سے۔"

عیون ماند آنکھوں سے اس کے عمر رسیدہ چہرے کی جھرّیوں کو تکتی رہی۔ اور وہ عسرت اور بدحالی کا نشان بنا بیٹھا رہا۔ جب وہ پرانی حویلی میں قاری کے طور پر ملازمت کرتا تھا، ان دنوں میں وہ کتنا مضبوط اور طاقت ور ہوا کرتا تھا۔ وہ ہر روز فجر کے بعد ان کے گھر آکر قہوہ پیتا، قرآن کی تلاوت کرتا اور مذہبی مسائل پر عیون کی والدہ کی راہ نمائی کرتا۔ اسی نے عیون کی شادی کے روز اسے دعا دیتے ہوئے کہا تھا؛ "خدا تمھیں عزّت دے اور تمھاری قسمت اچھی ہو" ماضی کے دھندلے گوشوں سے ایک پُرمہر تعلق یادوں اور آنسوؤں کی لہروں پر گویا امڈا چلا آتا تھا۔

اس نے اپنے ساخوردہ جوتے اتار دیے، کرسی پر دوزانو ہو کر بیٹھ گیا اور قرآن کی تلاوت کرنے لگا۔

جب وہ قہوہ پی چکا اور کمرے میں صرف وہ دونوں رہ گئے تو عیون نے کہا؛

"میں اکیلی ہو گئی ہوں، شیخ طٰہٰ "

وہ گویا احتجاج کرتے ہوئے بولا؛

"لیکن خدا تمھارے ساتھ ہے، خانم عیون"

"میں ہر وقت فکرمند اور خوفزدہ رہتی ہوں۔"

"خدا پر بھروسا رکھو، خانم عیون"

"کاش تم مجھے روز ملنے آ سکتے"

"میں بہت خوشی سے روز آؤں گا!"

"تمھارے معاملات کیسے چل رہے ہیں شیخ طٰہٰ؟"

"خدا کی یہی مرضی تھی کہ تلاوت کی ریکارڈوں کی وجہ سے ہم بےروزگار ہو جائیں، لیکن خدا اپنے غلام کو کبھی فراموش نہیں کرے گا۔ اس وقت تو سب سے اہم بات یہ ہے کہ تم اور مایوسی کے سامنے ہتھیار نہ ڈالو۔"

مجھے تشویش ہے شیخ طٰہٰ! عدلیہ کے سوا میرے پاس کوئی بھی نہیں ۔ اگر وہ مجھے چھوڑ دے ۔"

"لیکن خدا تمھارے ساتھ ہے، خانم عیون!"

"مگر میں تنہا ہوں۔"

اس نے ناراضی سے اپنے ہاتھ کو گردش دی، اور بولا؛

"کتنے افسوس کی بات ہے!"

"کیا میں نے غلط کہا، شیخ طٰہٰ؟"

"نہیں، لیکن تمھارا خدا پر ایمان نہیں رہا۔"

Scanned with CamScanner

"میرا ایمان ہے! میرا بیٹا اور میرا شوہر باری باری مجھ سے بچھڑ گئے، پھر بھی میرا ایمان ہے۔

"نہیں تمہارا ایمان نہیں رہا، خانم عیون!"

وہ ناخوش ہو کر خاموش ہو رہی۔ شیخ طہ نے کہا،

"نارا ض نہ ہو! جس کا ایمان ہو اس کے دل میں تشویش، خوف اور مایوسی کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔"

"میرا ایمان ہے، لیکن میں بستر مرگ پر ہوں اور عدلیہ کے رحم و کرم پر ہوں۔"

"ایمان والے صرف خدا کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں، کسی اور کے نہیں۔"

"اس کی تبلیغ کرنا کتنا آسان ہے، اور اس پر عمل کرنا کتنا مشکل!"

شیخ طہ نے تاسّف سے سر ہلایا اور کہا،

"ہاں، تبلیغ کرنا کتنا آسان ہے، اور عمل کرنا کتنا مشکل!"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"

"میں روز تمہارے پاس آنا چاہتا ہوں۔"

"ضرور، خدا کے لیے، شیخ طہٰ!"

"مگر تمہیں ایمان کی ضرورت ہے، ورنہ ایک بوڑھا اندھا آدمی تمہاری کیا مدد کر سکتا ہے۔"

اس نے کچھ توقف کیا، پھر جھجھکتے ہوئے بولی،

"لیکن شاید اسے ناگوار گزرے، عدلیہ کو!"

"میں پھر بھی آؤں گا۔"

"لیکن اگر ۔ فرض کرو ۔"

"یقین رکھو، میں روز تمہارے پاس آؤں گا۔ اگر اسے برا لگتا ہے تو بےشک دیوار سے اپنا سر پھوڑ لے۔"

عیون گھبرا کر دبی آواز میں بولی،

"آہستہ بولو شیخ طہٰ! ہمیں اس کو غصّہ نہیں دلانا چاہیے۔"

"خانم عیون، بھول جاؤ کہ تم اس کے رحم و کرم پر ہو۔ تم صرف خدا کے رحم و کرم پر ہو!"

"ہاں، ہاں، ہم سب خدا کے رحم و کرم پر ہیں۔ لیکن سوچو تو سہی اگر اسے غصّہ آ گیا تو میرا کیا ہو گا۔"

"کچھ نہیں ہو گا! خدا کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"یہ سچ ہے شیخ طہ، لیکن میری تنہائی کا خیال کرو، اگر وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی ۔"

"وہ تمہیں چھوڑ کر نہیں جائے گی خانم عیون، کیونکہ وہ تمہاری اس سے زیادہ محتاج ہے جتنی تم اس کی محتاج ہو۔"

"میں تو ضعیف ہوں، اس میں طاقت ہے، اسے کہیں بھی کام مل سکتا ہے۔"

"ہاں اسے کہیں بھی کام مل سکتا ہے، لیکن ملازمہ کے طور پر، یہاں تو وہ مالکن بنی بیٹھی ہے۔"

شاید تم ٹھیک کہتے ہو، لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں بالکل بے یار و مددگار ہوں۔"

اس نے اپنا عصا زمین پر مارا، اور کہا،

"تمہاری آدھی بیماری تو اس پر انحصار کی وجہ سے ہے۔"

"لیکن میری بیماری ایک حقیقت ہے۔ ڈاکٹروں کا یہی کہنا ہے۔"

"میں بیماری اور ڈاکٹروں پر یقین نہیں رکھتا۔ پھر بھی میں فی الحال تمہاری بات مان لیتا ہوں۔ خانم عیون، فرض کرو وہ تمہیں چھوڑ کر چلی گئی، جیسا کہ تمہیں اندیشہ ہے، تو میں اپنی بڑی بیٹی کو تمہارے پاس رہنے کے لیے لے آؤں گا۔ اسے طلاق ہو چکی ہے۔"

اس کی دھندلی آنکھوں میں ایک لمحے کو روشنی سی چمکی۔ اس نے بیتابی سے پوچھا،

"واقعی، شیخ طہٰ؟"

"ہاں، کیوں نہیں؟ تمہاری خاطر میں اس کے بغیر رہ لوں گا۔"

اس نے شرمندہ ہو کر جواب دیا،

"لیکن تم تنہا کیسے رہو گے؟"

وہ پہلی بار ہنسا، اور بولا،

"ہاں، ایک بوڑھا اندھا آدمی اکیلا کیسے رہے گا؟ آخر اس کی طلاق سے پہلے میں اکیلا رہتا ہی تھا۔"

"میں تم پر بوجھ نہیں بننا چاہتی۔"

"تم صرف خود پر بوجھ بنی ہوئی ہو۔ خدا تمہاری مدد کرے!"

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا جو سکون اور آسودگی سے معمور تھا۔

اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور قرآن کی تلاوت کرنے لگا۔

اب اس کے جانے کا وقت تھا۔ اس نے نرمی سے سر ہلا کر خدا حافظ کہا، اور چلا گیا۔

عیون کو ایک طویل عرصے کے بعد ایک تسکین کا احساس ہوا۔ اس نے عدلیہ کو بلایا اور اس سے کہا،

"عدلیہ! دیکھو، شیخ طہ جب بھی آئیں تو ان کا احترام اور عزّت سے استقبال کرنا۔"

ناگواری سے عدلیہ کی تیوری پر بل پڑ گئے اور وہ تنک مزاجی سے بولی،

"مگر خانم عیون، وہ بہت غلیظ ہے!"

"وہ ہماری پرانی حویلی کا قاری ہے۔ اس کی رفاقت مجھے اپنے ماں باپ سے ورثے میں ملی ہے۔"

"خانم، میں نے اس کے ماتھے پر جوئیں چلتی دیکھی تھیں۔"

عیون طیش میں آ گئی،

"مجھے اس کی کوئی پروا نہیں! وہ بہرحال بزرگ آدمی ہے۔"

عدلیہ دھمکانے والے لہجے میں بولی،

"لیکن میرے ذمے پہلے ہی اتنا کام ہے۔"

عیون کی آواز میں لجاجت آ گئی،

Scanned with CamScanner

"خدا کے لیے ایسا نہ کہو۔ یہ میری خواہش ہے اور میں تم سے اس کے احترام کی توقع رکھتی ہوں۔

"لیکن میں نے خود دیکھا کہ ــ"

عیون اس کی بات کاٹ کر سختی سے بولی،

"وہ بزرگ آدمی ہے اور تمھیں میرا حکم ماننا ہو گا۔"

عدلیہ کا چہرہ تن گیا۔ وہ کچھ کہنے کو تھی، لیکن عیون کی تاکید نے اسے باز رکھا،

"جو تم سے کہا جائے، وہ کرو، بحث مت کرو۔"

عدلیہ کے چہرے پر استعجاب چھا گیا۔ اس نے چونک کر تعجب سے عیون کو دیکھا۔ وہ دونوں کچھ دیر تک ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں، لیکن عیون نے عدلیہ کی تیز نظروں سے بار نہ مانی، وہ پُرعزم انداز میں اسے جواباً گھورتی رہی۔ اس نے اپنی بیماری اور خوف کی کوئی پروا نہ کی۔ اسے اپنے وجود کی اندرونی تہوں میں جیت کی پُرحرارت لرزش محسوس ہونے لگی۔

عدلیہ نے بالآخر اپنی آنکھیں جھکا لیں، اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ مگر عیون نے معاملے کو یہیں ختم نہیں کیا، وہ پوری طرح مطمئن اور پُراعتماد ہونا چاہتی تھی۔ اس نے عدلیہ کو دوبارہ آواز دی۔ عدلیہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے ناگواری اور بےصبری سے کہا،

"کیا بات ہے؟ چولھے پر ہانڈی چڑھی ہوئی ہے۔"

عیون نے مضبوط لہجے میں اس سے پوچھا،

"مجھے بتاؤ تم شیخ طہ کا کیسے استقبال کرو گی؟"

"کون شیخ طہ؟"

عیون طیش میں آ کر چلائی،

"کیا؟ تم مجھ سے مذاق کرتی ہو، عدلیہ؟"

"آپ خفا کیوں ہو رہی ہیں؟ میں نے یہی تو پوچھا ہے کہ شیخ طہ کون ہے؟"

"کیا تم شیخ طہ کو نہیں جانتیں؟"

"میں نے اس کا نام بھی کبھی نہیں سنا۔"

عیون نے جدّوجہد جاری رکھنے کے عزم کے ساتھ جواب دیا،

"وہی بوڑھا قاری جو ابھی کچھ دیر پہلے یہاں بیٹھا تھا، جسے تم نے خود قہوہ پیش کیا تھا۔"

عدلیہ نے شک اور تشویش سے اس کے چہرے کو دیکھا، اور بولی،

"آج تو گھر میں کوئی بھی نہیں آیا، نہ کوئی قاری نہ دنیادار۔ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟"

غصّے سے عیون کی آواز رُندھ گئی،

"کیسی باتیں کر رہی ہوں؟ تم اتنی گستاخ ہو گئی ہو ــ"

"مجھے آپ کی باتوں سے خوف آ رہا ہے۔ شیخ طہ کون ہے؟"

"کیا تم پاگل ہو گئی ہو یا مجھے پاگل کر دینا چاہتی ہو؟"

بڑھتے ہوئے اضطراب کے ساتھ عدلیہ نے جواب دیا،

"اپنی بیٹی کی جان کی قسم، میں نے نہ کبھی شیخ طہ کو دیکھا نہ اس کا نام سنا۔"

عیون کی آواز اتنی بلند ہو گئی جتنی کئی سال سے نہیں ہوئی تھی۔ اس نے چلّا کر کہا،

"اب تم قسم تک کھا رہی ہو! تم میرے خلاف سازش کر رہی ہو۔ تم مجھے باور کرانا چاہتی ہو کہ مجھے ایسی چیزیں نظر آ رہی ہیں جن کا وجود نہیں، کہ میں پاگل ہوں۔ یہی چاہتی ہو نا؟ یہی چاہتی ہو نا کہ میں اپنے آخری دوست سے بھی محروم ہو جاؤں؟"

عدلیہ کی آنکھیں مارے خوف سے پھٹنے لگیں۔ اس کی تنک مزاجی ذھیر ہو گئی۔ وہ لرزتی ہوئی آواز میں چلائی،

"خانم عیون، آپ اپنے حواس میں نہیں ہیں۔"

"خاموش رہو! میں تم سے نہیں ڈرتی۔ میں تمھاری محتاج نہیں ہوں۔ وہ یہاں روز میرے پاس آیا کرے گا۔ یہ میرا حکم ہے اور تمھیں اس کو بحث کیے بغیر ماننا ہو گا۔ خبردار جو اس کا راستا روکنے کی کوشش کی! میں تمھیں گھر سے نکال دوں گی۔"

عدلیہ کا رنگ زرد ہو گیا اور آنکھیں اُبل پڑیں۔ اس نے عاجزی سے کہا،

"خانم، خود کو تھکائیے مت۔ اپنے ذھن کو سکون سے رکھیے۔ میں بہت خوشی سے آپ کا حکم مانوں گی۔"

لیکن عیون چلاتی رہی،

"جھوٹی! کمینی! چور! زانیہ! میں اتنے سال سے تجھے برداشت کرتی آ رہی ہوں۔ میں تیرا منحوس چہرہ نہیں دیکھنا چاہتی۔ میرے بغیر تیری قیمت دو کوڑی بھی نہیں۔ مجھے تیری کوئی ضرورت نہیں۔ نکل جا! جہنّم میں جا! خدا کی نعمتوں نے تیرا دماغ خراب کر دیا ہے۔ تجھے شکر ادا کرنا چاہیے تھا، مگر تُو دن رات مجھے ذلیل کرتی رہی، ڈراتی رہی، اذیّت دیتی رہی، نکل جا! آج کے بعد اپنی شکل مت دکھانا۔ خدا تجھے غارت کرے!"

عدلیہ چند قدم پیچھے ہٹی۔ دہشت نے اسے نرغے میں لے کر گویا اس کے دماغ کو نچوڑ ڈالا تھا۔ اچانک وہ پلٹی، اِدھر اُدھر دیکھا اور زور زور سے چلاتی ہوئی تیز ہوا کی طرح دوڑتی ہوئی باہر نکل گئی۔

(عربی)

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

Scanned with CamScanner

لیو تالستائی

پیالا

"الیوشا" چھوٹے بھائی کا نام تھا۔ اسے سب الیوشا ہی پکارتے تھے، لیکن ایک دن یوں ہوا کہ اس کی ماں نے اسے کسی محلے دار کے گھر دودھ پہنچانے بھیجا تو وہ راہ میں ٹھوکر کھا کر سنبھل نہیں سکا اور ٹوٹے ہوئے پیالے کے ساتھ گھر لوٹ آیا۔ اس دن الیوشا کو گھر میں مار پڑی اور جب وہ باہر نکلا تو اسے گلی کے بچّوں نے چھیڑنا شروع کر دیا۔ "۔ پیالا! پیالا! الیوشا پیالا۔" اس دن سے الیوشا کا نام پیالا پڑ گیا۔

الیوشا کے کان اس کے چہرے کی بہ نسبت بڑے تھے۔ ایسے بڑے کان، کہ اسے دیکھ کر لگتا تھا جیسے کوئی بڑا پرندہ پر پھیلائے اس کے کاندھوں پر آ بیٹھا ہو۔ گاؤں میں ایک اسکول موجود تھا، لیکن پڑھنا لکھنا الیوشا کے لیے مشکل کام ثابت ہوا، اور پھر اس کے پاس وقت بھی نہیں تھا۔ اس کے بڑا بھائی شہر میں ایک تاجر کے گھر ملازم تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جس دن سے الیوشا نے چلنا شروع کیا، اسی دن سے گھر کا کام کرنا بھی شروع کر دیا تھا۔ چھ سال کی عمر میں وہ اپنے باپ کی تمام بکریوں کا رکھوالا بن گیا، اور کچھ ہی عرصے بعد وہ گھوڑوں کی دن رات نگہداشت پر مامور کر دیا گیا۔ بارہ برس کا ہونے تک وہ کھیتوں میں ہل چلانے اور گھوڑا گاڑی پر شہر کا سامان لانے کے فرائض انجام دینے لگا۔ اس کے چہرے پر ہمہ وقت تازگی اور شگفتگی رہتی۔ محلّے کے بچّے اس پر ہنستے تو وہ خاموشی سے انہیں دیکھتا رہتا، یا خود بھی ہنسنے لگتا۔ اس کا باپ نارا ض ہوتا تو وہ سر جھکا کر اس کی ڈانٹ سنتا، اور جب باپ کے دل کی بھڑاس نکل جاتی تو وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنے ادھورے کام کی طرف پلٹ جاتا۔

جب الیوشا انّیس سال کا ہوا تو اس کے بڑے بھائی کو جبری بھرتی والے لے گئے۔ الیوشا کو بتایا گیا کہ اب اسے شہر جا کر اپنے بھائی کی جگہ ملازمت کرنا ہو گی۔ دوسرے دن اسے بڑے بھائی کے بڑے جوتے پہنائے گئے اور شہر لے جا کر تاجر کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ تاجر کو الیوشا کے نرم نقوش اور نازک ہاتھ پاؤں، کام کے لیے ناموزوں معلوم ہوئے۔

"میں سمجھ رہا تھا کہ سائمن کی جگہ مجھے اچھا ملازم مل جائے گا۔" تاجر نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا، "یہ میرے کس کام کا ہے؟"

"یہ ہر کام کر سکتا ہے۔" الیوشا کا باپ فخر سے بولا، "دس لڑکوں کی جگہ یہ اکیلا کافی ہے۔ کمزور لگتا ہے، لیکن آپ اسے تھکا نہیں سکتے۔"

"خیر یہ تو معلوم ہو جائے گا"۔ تاجر نے ایک مرتبہ پھر الیوشا کو غور سے دیکھا۔

"۔ اور پلٹ کر جواب دینا تو اس نے سیکھا ہی نہیں۔ اس کا بس چلے تو ساری زندگی کھانا کھائے بغیر کام کرتا رہے۔"

"دیکھ لیں گے۔ چھوڑ جاؤ۔" تاجر نے بےدلی سے کہا۔

یہ الیوشا کی نئی زندگی کا آغاز تھا۔

تاجر کا خاندان زیادہ بڑا نہیں تھا۔ بوڑھی ماں اور بیوی کے علاوہ دو بیٹے تھے، جن میں سے ایک تعلیمی سرگرمیوں میں نمایاں اور دوسرا دنیاوی معاملات میں ہوشیار تھا۔ سب سے چھوٹی بیٹی تھی جو ہائی اسکول کے آخری درجے میں تھی۔

ابتدا میں الیوشا کسی کو پسند نہیں آیا۔ وہ کسان زادہ تھا، اور انہیں اب تک اس کا وجود کھیت کی مٹّی سے اٹا ہوا لگتا تھا۔اس کا لباس دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے اس نے پورا بدن ایک چادر سے ڈھک لیا ہو۔ اسے مہذّب لوگوں سے گفتگو کا ڈھنگ نہیں آتا تھا، اور وہ معزّز افراد کے احوالیہ جملوں میں استعمال ہونے والے الفاظ سے ناواقف تھا۔ بہر حال، کچھ دنوں بعد تاجر کے گھر والے الیوشا کے عادی ہو گئے؛ بالآخر اس کی محنتی طبیعت نے ان کا دل خوش کر دیا تھا۔ انہیں معلوم ہو گیا کہ وہ کسی کام کسی بات کا برا نہیں مانتا، پلٹ کر جواب نہیں دیتا اور ایک کام ختم کرنے کے بعد بغیر دم لیے دوسرا کام شروع کر دیتا ہے۔ آہستہ آہستہ تاجر کے گھر کا سارا کام الیوشا کے سپرد ہو گیا۔ جتنی تیزی سے وہ اپنی ذمّے داریاں نبھاتا گیا، اتنی تیزی سے اس کے فرائض میں اضافہ ہوتا گیا۔ وہ علی الصّباح بیدار ہوتا، اور یکسوئی کے ساتھ ہر کام نمٹاتا جاتا۔ تاجر کی بیوی اور اس کی ماں اور بیٹی اور بیٹے اور خادمہ اور خانساماں چھوٹے بڑے کاموں کے سلسلے میں اسے یہاں وہاں بھیجتے رہتے اور وہ صبح سے شام تک چاروں سمتوں میں گردش کرتا نظر آتا۔

اسے تمام دن اس طرح کے جملے سنائی دیتے؛

"الیوشا، دوڑ کر جاؤ اور اسے یہیں لے آؤ۔"

"ذرا اس کا خیال رکھنا الیوشا۔"

"واپسی پر اس کی طرف سے بھی ہوتے آنا، اور ۔"

"یہ نہ سنوں کہ تم بھول گئے تھے۔"

"ہاں! ہاں! یہ بھی ضروری ہے۔"

الیوشا سب کی سُنتا، یاد رکھتا، مسکراتا رہتا، اور ایک کے بعد دوسرا کام کرتا چلا جاتا۔

کچھ عرصے بعد الیوشا کے اونچے جوتے اُدھڑنے لگے، اور جگہ جگہ سے اس کی ایڑیوں اور پنجوں کی کھال جھلکنے لگی۔ تاجر نے اسے جوتوں کا نیا جوڑا منگوا دیا۔ نئے جوتے دیکھ کر

Scanned with CamScanner

الیوشا کا چہرہ جگمگانے لگا، مگر نئے جوتوں نے اس کے پرانے پیروں کو فوراً قبول نہیں کیا، اور شام تک وہ جوتوں کے کاٹنے سے بےحال ہو گیا۔ اسے یہ خوف بھی تھا کہ نئے جوتوں کے پیسے اس کی تنخواہ سے کاٹ لیے جائیں گے اور جب اس کا باپ اس کی تنخواہ وصول کرنے آئے گا تو اس پر بہت خفا ہو گا۔ کچھ عرصے سے اس کا باپ اسے مسلسل تنبیہ کر رہا تھا کہ وہ اپنے جوتے بہت تیزی سے گھس رہا ہے اور اس سلسلے میں اسے احتیاط برتنی چاہیے۔

الیوشا منہ اندھیرے اٹھ کر آتش دان کے لیے لکڑیاں تراشتا، صحن اور بیرونی احاطے کی صفائی کرتا، گھوڑوں کا راتب اور گائے کا چارا تیار کرتا، چولھا گرم کرتا، گھر بھر کے جوتے چمکاتا، مالک کے کپڑے جھاڑ کر دھوپ میں پھیلاتا، دیواریں اور فرنیچر پونچھتا، پھر وہ خانساماں کے کہنے پر سودا لینے بازار کا رخ کرتا یا خادمہ کی ہدایت پر برتن دھونے لگتا۔ اس سے فارغ ہوتا تو اسے کسی کے نام کی چٹھی دے کر شہر کے دوسرے حصّے میں بھیجا جاتا اور واپسی پر چھوٹی بیٹی کو اسکول سے لانے کی ذمّے داری سونپی جاتی۔ اس کے باوجود کوئی نہ کوئی بول پڑتا "الیوشا! خدا کے بندے کہاں رہ گئے تھے ۔ اتنا فاصلہ تو نہیں تھا ۔ اچھا اب فوراً جاؤ، اور ۔ " اور الیوشا فوراً جاتا اور تن دہی سے نئے کام میں مصروف ہو جاتا۔

فرصت کا لمحہ ملتا تو وہ روٹی پر سالن ڈال کر کھانے لگتا، لیکن اسی دوران کوئی کام آ پڑتا تو وہ روٹی کو گول بنا کر ہاتھ میں لیے اپنے ہدف کی طرف دوڑ پڑتا۔ خادمہ اسے کھانے کے وقت پر نہ پہنچنے پر ڈانٹتی، لیکن اس کی مجبوری پر رحم کھا کر وہ اس کے لیے کچھ نہ کچھ بچا کر بھی رکھ لیتی تھی۔

الیوشا زیادہ تر خاموش رہتا تھا۔ جب اسے بات کرنا ہی پڑ جاتی تو وہ جملوں کی جگہ محض الفاظ بول کر اپنا مدّعا بیان کرتا۔ اگر کوئی اس سے پوچھتا کہ کیا وہ فلاں فلاں کام کر سکتا ہے؟ "کیوں نہیں؟" وہ جواب دیتا، اور مخاطب کا جملہ مکمّل ہونے سے قبل ہی کام شروع کر دیتا تھا۔

اسے کوئی دُعا یاد نہیں تھی۔ بچپن میں اس کی ماں نے اسے چند دعائیں یاد کرائی تھیں جو وہ وقت گزرنے کے ساتھ بھول گیا تھا۔

اس طرح الیوشا نے دو برس گزار دیے۔ پھر ایک ایسی بات ہوئی جو اس کی زندگی میں پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔

الیوشا جانتا تھا کہ ہر آدمی کو دوسرے آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی نہ کسی سطح پر سب ایک دوسرے کے کام آتے ہیں، اسی لیے دنیا میں انسانوں کے انسانوں سے تعلقات قائم ہیں۔ لیکن یہ بات الیوشا کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ کوئی صورتِ حال ایسی بھی ہوتی ہے جب آدمی چاہتا ہے کہ کوئی دوسرا اس کے ساتھ رہے جبکہ اسے دوسرے سے کوئی کام نہیں لینا ہوتا۔

انسانوں کے درمیان ایسا بھی تعلق ہو سکتا ہے! یہ الیوشا کے لیے انکشاف تھا، اور یہ بات تانیا کے توسط سے اس پر منکشف ہوئی تھی۔ تانیا اس نوجوان، یتیم لڑکی کا نام تھا جو تاجر کے گھر خادمہ کی حیثیت سے کام کرتی تھی۔ وہ بھی الیوشا کی طرح محنتی طبیعت کی تھی، اور اسے الیوشا کی یکسوئی پر پیار آتا تھا۔ اسے دیکھ کر الیوشا کو پہلی بار محسوس ہوا کہ دنیا میں کوئی ایسا بھی ہے جسے اس کے کام کی نہیں بلکہ خود اس کی ضرورت ہے ۔ بچپن میں جب

الیوشا کی ماں اس سے ہمدردی کا اظہار کرتی تھی تو وہ حیران نہیں ہوتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ تمام مائیں اپنے بچوں سے پیار کرتی ہیں۔ لیکن تانیا نے اسے حیران کر دیا تھا۔ اس کا الیوشا سے کوئی رشتہ نہیں تھا مگر پھر بھی وہ اس کے لیے مکھن لگی روٹی بچا کر رکھتی تھی۔ الیوشا چپڑی روٹی کھاتا تو وہ اس کے سامنے بیٹھ کر خاموشی سے اسے دیکھتی رہتی۔ اس دوران الیوشا کی نظریں اس سے ملتیں تو وہ بےساختہ ہنس پڑتی۔ ایک لمحے کو الیوشا جھینپ جاتا اور پھر خود بھی ہنسنے لگتا۔

یہ صورتِ حال اتنی انوکھی اور پُرکیف تھی کہ ابتدا میں الیوشا خوف زدہ سا ہو گیا۔ اسے خیال آیا کہ وہ پہلے جیسی تیزرفتاری سے کام نہیں کر سکے گا۔ تانیا نے اس کی زندگی میں وہ دریچہ کھول دیا تھا جہاں سے اس نے پہلی بار پھول اور تتلیاں دیکھی تھیں۔ اس سے پہلے بھی اسے یہ چیزیں کہیں نہ کہیں نظر آتی رہی تھیں، لیکن فرصت نہ ہونے کے باعث وہ انھیں کبھی صحیح طور پر دیکھ نہیں سکا تھا۔ کام کے دوران جب اس کی نظر اپنی پتلون کے اس حصّے پر پڑتی جو تانیا نے انتہائی مہارت سے رفو کیا ہوتا تو وہ بےاختیار کہتا۔ "شکریہ، تانیا! شکریہ! شکریہ!"

جب بھی ممکن ہوتا دونوں ایک دوسرے کی مدد کرتے، باتیں کرتے، ہنستے، اور اپنے بچپن کے واقعات دہراتے۔ تانیا کو باتیں کرنے کا شوق تھا۔ اس نے الیوشا کو بتایا کہ کس طرح اس نے بچپن میں اپنے والدین کو یکے بعد دیگرے مرتے دیکھا، اور پھر کس طرح وہ اپنی خالہ کے پاس پہنچ گئی۔ الیوشا نے سن رکھا تھا کہ گاؤں سے کام کی تلاش میں شہر آنے والے اکثر لڑکے گھریلو خادماؤں سے شادی کر لیتے ہیں۔ ایک مرتبہ تانیا نے الیوشا سے پوچھا کہ اس کا باپ اس کی شادی کے بارے میں کیا ارادہ رکھتا ہے۔ "معلوم نہیں"، الیوشا نے کندھے اچکا کر جواب دیا، "بہرحال گاؤں کی لڑکی سے تو شادی مشکل ہے۔"

"تو تم کسی کو پسند کرتے ہو؟" تانیا نے مسکراتے ہوئے کہا

"میں تم سے شادی کروں گا!" الیوشا نے کسانوں کی پیدائشی صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "تم کرو گی؟"

"لو اور سنو۔ پیالا مجھ سے شادی کرے گا!" یہ کہہ کر تانیا اس کی سادہ لوحی اور بےباکی پر ہنسنے لگی۔ پھر یکدم سنجیدہ ہو کر بولی، "کیوں نہیں، الیوشا! کیوں نہیں۔"

ایک ہفتے بعد الیوشا کا باپ اس کی تنخواہ وصول کرنے شہر آیا۔ تاجر کی بیوی تک خبر پہنچ چکی تھی کہ الیوشا پر تانیا سے شادی کرنے کی دُھن سوار ہے۔ اس نے اپنے خاوند کو پہلے ہی ہوشیار کر دیا تھا۔ "شادی کے بعد کوئی لڑکی اتنی محنت نہیں کر سکتی۔ بچوں کے ساتھ تانیا ہمارے لیے بیکار ہو جائے گی۔"

تاجر نے الیوشا کی تنخواہ اس کے باپ کی جانب بڑھائی تو وہ ہمیشہ کی طرح کھِل اٹھا۔ "میرا بیٹا کیسا کام کر رہا ہے؟ انکار کرنا تو وہ جانتا ہی نہیں۔"

"جہاں تک کام کا تعلق ہے ۔" تاجر سنجیدہ لہجے میں بولا، "مجھے کوئی شکایت نہیں۔ مگر وہ ہماری خادمہ سے شادی کے خواب دیکھ رہا ہے۔ یہ ہمارے لیے سود مند نہیں ہو گا۔"

Scanned with CamScanner

"ارے! اس کی یہ جرأت۔" الیوشا کے باپ نے حیرت سے کہا۔ پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ پُریقین انداز میں بولا، "آپ بالکل فکر نہ کریں۔ میں یہ معاملہ ختم کر کے جاؤں گا۔"

جب الیوشا کوئی کام بُنا کر پھولی ہوئی سانس کے ساتھ گھر لوٹا تو اس کا باپ اس کے انتظار میں بیٹھا تھا۔

"میں تمھیں سمجھدار اور سعادت مند بیٹا سمجھتا تھا، لیکن ۔ یہ سب کیا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں ۔ یہ کہ ۔ کچھ بھی نہیں۔"

"کیا کچھ بھی نہیں؟ شادی کا خیال دل سے نکال دو۔ جب وقت آئے گا میں خود تمھاری شادی کراؤں گا ۔ کام کی عورت سے ! ۔ شہر کی مکّار عورتوں سے دور رہو۔ سمجھے؟"

اس کا باپ دیر تک اسے تُند لہجے میں نصیحتیں کرتا رہا،اور وہ سر جھکائے سنتا رہا۔ جب باپ خاموش ہوا تو الیوشا کے چہرے پر وہی تبسم پھیل گیا۔

"تو پھر؟" باپ کا لہجہ سوالیہ ہو گیا۔ "میں یہ معاملہ ختم سمجھوں؟"

"جی ہاں!" الیوشا نے اثبات میں سر ہلایا۔

جب اس کا باپ رخصت ہو گیا تو تانیا کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ پردے کے پیچھے کھڑی سب کچھ سنتی رہی تھی۔ اس کی آنکھیں نم تھیں۔

"ہمیں یہ معاملہ ختم سمجھنا چاہیے۔" الیوشا نے نرمی سے کہا۔

تانیا نے پلکیں جھپکائیں تو دو آنسو اس کے رخساروں پر واضح لکیریں بنا گئے۔

الیوشا نے نظر بھر کر تانیا کو دیکھا، گہری سانس لی، اور نحیف آواز میں کہا، "کیا کریں ۔ سب ناراض ہو رہے ہیں ۔ بھولنا ہی پڑے گا۔"

رات کو سونے سے قبل گھر کی کھڑکیاں بند کرنے کے دوران جب وہ بڑی خواب گاہ میں داخل ہوا تو تاجر کی بیوی اسے دیکھتے ہی بولی، "باپ سے ملاقات ہو گئی؟ اب سب کچھ بھول کر کام میں دل لگاؤ!"

"لگتا ہے بھولنا ہی پڑے گا۔" الیوشا نے مسکرا کر کہا، اور اچانک دیوار کی طرف منھ کر کے رونے لگا۔

اس دن کے بعد الیوشا نے کبھی شادی کا ذکر نہیں کیا۔ وہ پہلے سے زیادہ کام میں مصروف رہنے لگا تھا۔

سردیوں کی ایک صبح اسے چھت سے برف صاف کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ وہ برف کے ڈھیر بنا کر نیچے دھکیلنے لگا، اور کچھ ہی دیر میں اس نے پوری چھت صاف کر دی۔ اس کے بعد وہ روشن دانوں کے چھجّوں پر جمی برف ہٹانے کے لیے جھک رہا تھا کہ اس کا پاؤں پھسلا اور وہ نیچے آ گرا۔ اس کے جسم کا نچلا حصّہ تو برف کے ڈھیر میں دھنستا گیا، لیکن اس کا سر آہنی جنگلے سے ٹکرا گیا۔ گرنے کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا، مگر فوراً ہی لڑکھڑا کر دوبارہ برف پر لیٹ گیا۔ تاجر کی بیٹی اور تانیا دوڑتی چلی آئیں، "الیوشا تم ٹھیک ہو؟" "تمھیں چوٹ لگی ہے؟" دونوں کی آواز میں گھبراہٹ تھی۔

"ہاں ذرا چوٹ لگ گئی۔" اس نے دھیرے سے سر جھٹکتے ہوئے کہا، "لیکن ٹھیک ہے۔"

اس نے ایک مرتبہ پھر کھڑے ہونے کی کوشش کی، اور دوبارہ ناکام ہونے پر سر واپس ٹیک کر مسکرانے لگا۔

اسے لوگوں کی مدد سے اٹھا کر بستر پر لٹایا گیا۔ ڈاکٹر نے معائنے کے بعد اس سے پوچھا کہ وہ کہاں تکلیف محسوس کر رہا ہے۔ "سب جگہ،" اس نے آہستہ سے کہا، "لیکن ٹھیک ہے۔"

کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور بولا۔ "روشن دانوں کی برف رہ گئی ۔ ابّا کو بلوا لو۔"

الیوشا دو دن تک بستر پر رہا اور تیسرے دن انھوں نے پادری کو بلوا لیا۔

"تم مر رہے ہو، الیوشا؟" تانیا کا لہجہ سوالیہ تھا۔

"ہم ہمیشہ رہنے کے لیے تو نہیں آئے۔" الیوشا نے فطری صاف گوئی سے جواب دیا، "ایک دن مرنا بھی ہوتا ہے۔" پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ بولا، " ۔ اور دیکھا! یہ بھی اچھا ہوا انھوں نے ہمیں شادی نہیں کرنے دی۔ اب کتنا افسوس ہوتا۔"

وہ دھیرے دھیرے پادری کے کہے ہوئے الفاظ دہراتا رہا۔ اسے خیال آ رہا تھا کہ اگر آدمی سب کی بات مانتا رہے اور کسی کو ناراض نہ کرے تو نہایت اطمینان سے زندگی گزارتا ہے۔

"اگر یہاں ایسا ہوتا ہے،" اس نے سوچا، "تو وہاں بھی ایسا ہی ہوتا ہو گا۔"

اس نے زیادہ باتیں نہیں کیں۔ بس وقفے وقفے سے پانی مانگتا رہا۔ پھر اچانک وہ کسی بات پر چونک گیا۔ یوں لگا جیسے کوئی چیز اسے حیران کر رہی ہے۔ آنکھوں میں پھیلتی حیرت کے ساتھ اس نے ایک گہری سانس لی، بازو اور ٹانگیں سیدھی کیں، اور مر گیا۔

(روسی)

انگریزی سے ترجمہ: صغیر ملال

Scanned with CamScanner

کیم مونزو

جہاں گرد

اس نے اپنی زندگی کے پہلے بیس سال سرکس میں گزارے۔ آج ایک جگہ پڑاؤ ہے تو کل دوسری سمت کُوچ۔ ان بیس برسوں میں اس نے کبھی ایک شہر میں دوبارہ قدم نہ رکھا۔ کیا سرکس تھا وہ بھی، دیس دیس گھومتا ہوا، جیسے کوئی آوارہ گرد بےمقصد گلیوں گلیوں پھر رہا ہو۔ بازی گروں کا بیٹا، بچپن ہی سے وہ نت نئے اور انوکھے ماحول میں مست رہا۔ بونوں اور مسخروں سے اس کی یاری تھی؛ شیر اور اس کے سدھانے والے، تار پر چلنے والے، کمندوں پر جھولنے والے، آگ اگلنے والے، گھوڑے اور ہاتھی اس کے ساتھی تھے۔ وہ ایسے تین قبائلی امریکیوں اور دو انڈین رقاصاؤں سے واقف تھا جو چُھریوں کی بوچھار سے زندہ سلامت نکل آتے۔ چودہ سال کی عمر میں اسے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی جو لگاتار تین دن دوسری قطار میں آ کر بیٹھتی رہی۔ تیسرے دن جب وہ اسٹیج پر کتّوں کا تماشا دکھانے والی عورت کی مدد کر رہا تھا، لڑکی نے اس کو آنکھ ماری۔ وہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ جواباً کیا کرے۔ جب تک اس کو لڑکی سے بات کرنے کی ترکیب سُجھائی دیتی، سرکس کے خیمے اکھڑ چکے تھے، اور ویگنوں کی قطار دوسرے شہر کی طرف رواں دواں تھی۔

جب وہ بیس سال کا ہوا، تو سرکس پر زوال کا وقت شروع ہو چکا تھا۔ سب کا خیال تھا کہ سرکس سنیما اور ٹی وی کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ وہ جس سرکس میں ملازم تھا، اس نے اپنے خیمے ہمیشہ کے لیے لپیٹ لیے۔ جن کو کسی دوسرے سرکس میں نوکری مل سکتی تھی، وہ وہاں چلے گئے، لیکن سب ایسے خوش نصیب نہ تھے۔ اس عمر میں گو کہ اسے کسی اور سرکس میں اچھی جگہ مل سکتی تھی، اس نے آبائی پیشے کو خیرباد کہا اور کسی ایک جگہ پڑاؤ ڈالنے کا فیصلہ کیا۔

وہ ایک ریلوے کمپنی میں کلرک لگ گیا۔ بیس سال تک اس نے اس شہر سے باہر قدم نہ نکالا۔ وہ اپنا ہر دن ٹرینوں کی آمدورفت کے اوقات ترتیب دینے اور ان میں تبدیلیاں کرتے ہوئے گزارتا۔

ٹکٹوں پر چھپے ہوئے شہروں کے جانے پہچانے نام دیکھ کر اس کا دل کبھی نہ مچلتا کہ وہ دوبارہ وہاں جائے۔ جس نے آدھی دنیا بیس برس کا ہونے سے پہلے ہی دیکھ لی تھی، زندگی کے اگلے بیس سال ایک خاموش، سنسان مکان اور آہنی دروازوں والے دفتر میں کاٹ دیے۔ بیس سال تک وہ ایک ہی سڑک پر چل کر دفتر جاتا رہا۔

شروع کے دنوں میں شام کے وقت، بند دروازے کے پیچھے، تنہائی سے اکتا کر اس نے باری باری ان تمام شہروں کو یاد کرنا شروع کیا جو اس نے کبھی دیکھے تھے۔ پھر اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا ماضی دن بدن دور ہوتا جا رہا ہو۔ شاید ٹھہری ہوئی زندگی گزارنے کے لیے ایک خاص قسم کی طبیعت درکار ہوتی ہے۔ شاید وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ اس یکساں، ساکت زندگی کا عادی ہو جائے گا، وہ سوچتا۔ وہ اس ماحول اور یکسانیت کا جلد ہی عادی ہو گیا، جو اس کو اندر سے چاٹ چاٹ کر کھوکھلا کیے دے رہی تھی۔ نہ صرف یہ کہ وہ یکسانیت کے خلاف کسی ردّعمل کے قابل نہ رہا، بلکہ اس میں بیتے ہوئے دنوں کو یاد کرنے کی صلاحیت بھی ختم ہو گئی۔

لیکن ہر رات باقاعدگی سے، ایک کاریگر کی صنّاعی سے، وہ ایک متوازی زندگی خواب میں دیکھتا، وہ زندگی جو اس نے بیس سال تک دیس دیس گھوم کر گزاری تھی۔ ہر شب، ماضی کا ایک دن اس کے خواب میں جلوہ افروز ہوتا۔ اس طرح جب وہ چالیس برس کا ہوا تو اس نے خواب میں دیکھا کہ سرکس ختم ہو گیا ہے اور اس نے ایک جگہ سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ آدھی رات کو اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ پسینے میں شرابور گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ جیسے چھت کسی لمحے اس پر آ گرے گی۔ بیس سالہ خواب سے جاگنے پر اس نے اپنی ساری جمع پونجی بیچ ڈالی، اسٹیشن پہنچا اور پہلی ٹرین پکڑ لی۔

وہ شہر شہر گھومتا پھرا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ کھوئے ہوئے برسوں کا مداوا کرے گا۔ اس نے شہروں کی فہرست سے وہ نام کاٹ دیے جہاں وہ پہلے جا چکا تھا۔ پچاس برس کا ہونے تک وہ دنیا کا باقی آدھا حصہ بھی گھوم چکا تھا جو اس نے اپنی زندگی کے اوائل میں نہ دیکھا تھا۔ ہر شہر سے نکلتے ہوئے اسے احساس ہوتا کہ وہ وہاں سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو رہا ہے۔ اس کی پہلی نظر ہی آخری نظر ہوتی۔

تمام دنیا دیکھ لینے کے بعد، اب کسی اَن جانی جگہ پر قدم رکھنا اس کے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ کئی دنوں سے اسے خواب بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس نے اس شہر کا نام یاد کرنے کی کوشش کی جہاں اس نے پہلی بار ایک لڑکی کو پیار کیا تھا۔ وہ لڑکی اس کی عَم زاد تھی، اور تاروں پر چلتی تھی۔ ذہن پر زور ڈالنے کے باوجود وہ یاد نہ کر سکا کہ آیا وہ شہر برلن تھا یا ڈان زِگ۔ کیا اس نے تمام چیزیں تفصیل سے دیکھی تھیں، اس نے خود سے سوال کیا۔ اگر ایسا تھا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ اسے شہر کا نام یاد نہ رہتا۔ بہت سی جگہیں ایسی تھیں جن کو یاد رکھنا اب اس کے لیے ممکن نہ رہا تھا۔ ماضی کے کچھ حصے معدوم ہوتے جا رہے تھے۔ اسے احساس ہوا کہ دریاؤں کے رخ وہ نہ تھے جو کبھی اس کو یاد تھے۔ آخر دنیا دیکھنے کا کیا مقصد تھا جبکہ بالآخر یہ تمام شبیہیں ذہن سے معدوم ہو جانی تھیں، اس نے سوچا۔ اسے اپنی زندگی ایک تنے ہوئے تار کی مانند

Scanned with CamScanner

محسوس ہوئی۔

وہ پرما کی ٹرین کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ اس کی فہرست کا سب سے پہلا شہر اس کے ذہن سے بالکل معدوم ہو چکا تھا۔ یہ وہ شہر تھا جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔ اس کو احساس ہوا کہ اب اس کے لیے یہ یاد کرنا مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا تھا کہ اس کی ماں کیسی تھی۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے اس کی ماں کی شبیہ ایک آبی آئینے میں تحریر ہو اور لہروں میں گھل کر تحلیل ہوتی جا رہی ہو۔ لکڑی کی بنچ پر بیٹھا وہ ریل کی پٹریوں کے بیچ اگی ہوئی خود رَو گھاس کو تکتا رہا۔ اچانک وہ چونک اٹھا۔ اس کی نظروں کے سامنے کیا چیز تھی؟ وہ کیا دیکھ رہا تھا؟ کیا وہ جنگلی گھاس تھی؟ سرکنڈے تھے؟ کیا تھا؟ درختوں، پودوں اور جڑی بوٹیوں کے نام اس کے ذہن سے غائب ہو چکے تھے۔ وہ قطار میں لگے ہوئے سبز پودے کون سے تھے، اس نے خود سے پوچھا۔

اسے لگا کہ وہ کہیں کھو گیا ہے۔ اس نے نظریں اٹھائیں۔ پٹریوں کی دوسری طرف ایک سرکس کا بڑا سا، پھٹا ہوا پوسٹر چسپاں تھا۔ لمحے بھر کے لیے اسے خوشی کا احساس ہوا۔ اسے سرکس دیکھنے کا خیال آیا۔ اتنے سال بعد اسٹیج کے بجائے تماش بینوں کی قطار میں بیٹھ کر سرکس دیکھنے کا خیال کچھ ایسا برا نہ تھا۔ اس نے تاریخ اور مقام دیکھنے کے لیے پوسٹر پر دوبارہ نظر ڈالی، لیکن اس کی نگاہیں پوسٹر پر بنے ہوئے چہرے پر ٹک گئیں۔ سفیدی پھرے ہوئے چہرے کی ایک آنکھ پر کانٹی کا نشان تھا، دوسری آنکھ کے نیچے ایک لکیر تھی - وہ مسحور ہو کر چمکتی ہوئی تکونی ٹوپی، پھولی ہوئی ناک اور موٹے موٹے ہونٹوں کو تکنے لگا۔ اس نے دیکھا کہ ہونٹ دو دفعہ ہنسی کی شکل میں کھلے اور بند ہو گئے۔

پلیٹ فارم پر سناٹا تھا۔ وہ بنچ پر نیم دراز ہو گیا اورآنکھیں موند لیں۔ جمائی لیتے ہوئے اس نے دائیں بائیں نظر دوڑائی۔ مجھے یہ تک یاد نہیں کہ وہ شہر کیسا تھا جہاں میں پیدا ہوا، اس نے تھک کر سوچا۔

اس کے کانوں میں دروازہ کھلنے کی آہٹ آئی۔ ایک عورت نے گردن نکال کر دروازے سے باہر جھانکا اور دونوں اطراف نظر ڈالی۔ پھر وہ چہرہ غائب ہو گیا۔ جب اسے دروازہ بند ہونے کی آواز آئی تو اس کا ذہن بالکل خالی تھا۔ اسے یہ بھی یاد نہیں آ رہا تھا کہ آیا وہ دروازہ ابھی کھلا تھا، کون اندر گیا تھا، کوئی اندر گیا بھی تھا یا یہ کہ وہاں کوئی دروازہ تھا بھی یا نہیں۔

اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کیا ہو رہا ہے۔ اس کے ذہن میں ایک تصویر ابھری؛ ہرے بھرے بھیگے ہوئے جنگل کے کنارے رُوپہلے آسمان تلے چمکتا ہوا ایک سلیٹی تالاب۔ یہ تصویر اتنی واضح اور صاف تھی کہ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ منظر اس وقت اس کی نظر کے سامنے تھا یا وہ صرف ایک شبیہ تھی جو اس کے ذہن کے دریچوں میں ابھر آئی تھی۔ پھر اسے یادوں پر قابو نہ رہا۔ ایک ایک کرکے شبیہیں ابھرنے لگیں، جیسے ہوا نکلتے ہوئے غبارے فضا میں بلند ہوتے ہیں۔ غبار میں اَٹا ہوا ہوٹل ، سفید ویران دیواریں، کیوبسٹ فرنیچر۔ اچانک تمام تصویریں غائب ہو گئیں۔ اس کا ذہن یکدم خالی ہو گیا۔ صرف ایک سیاہ مستطیل رہ گیا۔ وہ بھول گیا کہ وہ کون سے شہر جا رہا تھا۔ اس نے حیرانی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ اسے یاد نہ رہا کہ وہ کون سی جگہ

تھی، دونوں اطراف افق میں گم ہوتی ہوئی فولاد کی متوازی پٹریاں کس لیے تھیں۔ جب ٹرین آئی تو وہ پہچان نہ سکا کہ وہ کیا شے تھی۔ نہ وہ اسے کوئی مشین لگی اور نہ کوئی عفریتہ۔ ان دونوں لفظوں کے معنی وہ بھول چکا تھا۔ چونکہ اسے یہ بھی یاد نہ رہا تھا کہ خوف کیا ہوتا ہے، اس نے بچنے کی کوئی کوشش نہ کی۔

کتالان (اسپین)
انگریزی سے ترجمہ: زینت حسام

کیم مُونزو (Quim Monzo)

۱۹۵۲ میں بارسلونا (اسپین) میں پیدا ہوئے۔ سولہ سال تک گرافک ڈیزائنر کے طور پر کام کیا۔ ستّر کی دہائی میں بارسلونا کے روزناموں کے لیے شمالی آئرلینڈ، ویت نام اور کمبوڈیا کی جنگوں کی رپورٹنگ کی۔ اپنی کہانیوں سے زیادہ شہرت پائی، لیکن فلموں میں مکالمہ نگاری، ریڈیو اور ٹیلی وژن کی اسکرپٹ نگاری اور ناولوں کے ترجمے بھی کر چکے ہیں۔ کہانیوں کے سات مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ۱۹۸۱ میں کتالان کریٹکس پرائز حاصل کیا۔ ان کی کہانیوں کے انگریزی ترجموں کا مجموعہ O' Clock ۱۹۸۶ میں امریکا سے شائع ہوا۔

Scanned with CamScanner

مظفر علی سید

اردو ادب کی صورتِ حال

۱

صورتِ حال یا سچوئیشن کیسی بھی کیوں نہ ہو، ایک طرف نہایت مخدوش رپورٹ کی جاتی ہے اور دوسری طرف معمول کے مطابق۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ مدت سے مخدوش چلے آنے کی وجہ سے یہی اس کا معمول بن گیا ہو۔

مخدوش ہونے کا ایک باعث انفرادی سطح پر، بےلگام تہذیبی قیادت کی خطر پسندی (Brinkmanship) بھی ہو سکتی ہے لیکن یہی رویّہ، اجتماعی سطح پر، بحران پسندی اور بحران خیزی کی صورت میں کارفرما نظر آتا ہے۔ بعض معاشرے اس وقت تک حرکت ہی میں نہیں آتے جب تک کوئی بحران یا دوسرے لفظوں میں کوئی شدید تاریخی آزمائش درپیش نہ ہو۔ اس وقت تک ان کی تمام تخلیقی قوتیں یا تو خوابیدہ رہتی ہیں یا پھر نکاس کا کوئی غیرتخلیقی راستہ تلاش کر لیتی ہیں جو کسی نئے اور بڑے بحران کی طرف لے جاتا ہے۔

اردو ادب کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ یہاں بھی ایک بحرانی صورتِ حال درپیش ہے تو یہ سامنے کی بات ہو گی۔ بحران تو خیر ہے ہی، بلکہ نہ ہوتا تو حیرانی کا مقام تھا، لیکن یہ خاص بحران جو ہمارے دیکھتے دیکھتے پیدا ہوا ہے، ان تمام بحرانوں سے، جن میں سے گزر کر اردو ادب ہم تک پہنچا ہے، کس لحاظ سے مختلف ہے اور ہمارے دور کی تخلیقی صلاحیت اس سے کیونکر عہدہ برآ ہو پائے گی، ان سوالوں پر سوچ بچار شاید بیکار نہ ہو۔

اصطلاحی زبان میں گفتگو کریں تو مسئلہ، بحران کی ساخت (Crisis Formation) سے زیادہ، بحران کی شناخت (Crisis Perception) اور اس سے آگے بڑھیں تو بحران کی پرداخت (Crisis Management) کا ہے۔ جب بحران موجود ہے تو جلد یا بدیر سب کے تجربے میں آ کر رہے گا، چاہے ہم کتنے ہی بےحس کیوں نہ ہوں، اس لیے کہ خودآگاہی کی طرح خودفریبی کی

rekhta

Scanned with CamScanner

بھی کوئی حد ضرور ہوتی ہے۔ لیکن حسّاسیت کو دانشوری میں تبدیل کر کے بحران کی نوعیت اور ماہیت کا اندازہ لگانا، پھر اس سے زیادہ ہمّت سے کام لیں تو اس پر قابو پانے کی کوئی صورت نکالنا اور بَن پڑے تو اسی بحران کو تاریخی تغیّر کی قوت محرکہ میں مُنتقلب کر دینا، یہ مراحل صورتِ حال کی شناخت و پرداخت اور تفہیم و تنظیم کے مراحل ہیں جن کا طے کرنا کوئی آسان کام نہیں۔

ممکن ہے ان اصطلاحوں کے استعمال ہی پر کسی کو اعتراض ہو، خصوصاً ادب کے سلسلے میں، کہ بالعموم مسائل کی تخصیص اور تشخیص کی حد تک تو ادب کو ایک کارگر وسیلہ تسلیم کر لیا جاتا ہے لیکن، اس کے ماورا، ادب کو مسائل کے علاج کی طرف رخ کرنے کی اجازت بہت کم ملتی ہے۔ تاہم ادب ہمارے دکھوں کا مداوا کر سکے یا نہ کر سکے، ان کو ایک تاریخی تقاضے اور ایک اجتماعی قوّت میں تبدیل کرنے کی کوشش ضرور کر سکتا ہے۔ بقول میر ؛

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر، میں ناکامیوں سے کام لیا

محبت نباہنے، یا دوسرے لفظوں میں کسی بہت بڑی انسانی کمٹ منٹ سے عہدہ برآ ہونے، کی صلاحیت تبھی پیدا ہو سکتی ہے کہ اپنی ناکامیوں کے دباؤ تلے پس جانے کی بجائے ان پر قابو پانے اور انہیں ایک تخلیقی توانائی میں تبدیل کرنے کی کوشش کی جائے۔ مینجمنٹ کا مفہوم ہے کام لینا، اور کام اسی چیز سے لیا جا سکتا ہے جو موجود ہو۔ گویا وضع موجود (Status Quo) ہی کے باطن سے وضع مطلوب (Status Requis) کا راستہ نکل سکتا ہے۔ پھر ناکامیوں سے کام وہی لے سکتا ہے جو سلیقہ رکھتا ہے، دوسرے لفظوں میں مینجمنٹ کی مہارت۔ اوپر سے، میر صاحب صرف یہ نہیں کہتے کہ انھوں نے ایسا کیا ہے بلکہ ایک عرصۂ کشمکش کے دوران یہی کارنامہ انھوں نے بارہا انجام دیا ہے۔ گویا ہر قدم پر انہیں ایک نہ ایک ناکامی سے واسطہ پڑا ہے اور ہر ناکامی ہمیشہ ان کے لیے کسی نہ کسی کمال کی تحصیل کا موجب بنی ہے لیکن خود بخود نہیں، اس لیے کہ تاریخ میں جو بھی مطلوبہ تغیّر پیدا ہوتا ہے، شعور و دانش کے ذریعے پیدا ہوتا ہے، اس تاریخی شعور اور دانشورانہ کمٹ منٹ کے ذریعے جو تاریخی عمل کا مرحلۂ اول ہے اور جس کے بغیر کسی بھی صورتِ حال پر دسترس حاصل نہیں ہو سکتی۔

میر صاحب کے طویل عرصۂ حیات کی طرح، اردو ادب کی تاریخ بھی ناکامیوں سے کام لینے کی مسلسل کشمکش کا نام ہے؛ ایک ایسی کشمکش جس کا سلسلۂ بیان ہمارے سلسلۂ حیات کی طرح جاری ہے، اور جس کا انجام وہی ہو گا جو ہمارا انجام ہو گا۔ تاریخ کے کسی بھی موڑ پر ادب کی جو بھی صورتِ حال ہو اس کے لیے ہمارے سوا کون ذمّے دار ہو سکتا ہے، خصوصاً استعماری تسلّط سے آزاد ہونے کے بعد۔

۲

تیسری دنیا کے بیشتر ممالک اس امر کے شاید ہیں کہ استعماری غلبے سے بظاہر آزادی حاصل

کرنے کے بعد بھی، استعمار کا عمل دخل کسی نہ کسی شکل میں ہماری صورتِ حال کا ایک حصّہ ہے۔ سیاسی استعمار کی بجائے معاشی اور تہذیبی استعمار، فکری اور نظریاتی استعمار، بڑے استعمار کی جگہ چھوٹا استعمار،لسانی استعمار، نسلی استعمار اور سب سے زیادہ غیرملکی استعمار کی جگہ ملکی اورمقامی استعمار۔ بقول ایک افریقی شاعر کے؛

اب تو ہم ہی شکاری ہیں، ہم ہی شکار

اس ذہنیت نے، جس کا نام "خود استعماریت" (Self Colonization) لگتا ہے کہ درست رکھا گیا ہے، تیسری دنیا کی تہذیبی اور تخلیقی صورتِ حال میں متعدّد عناصر ایسے داخل کیے ہیں جو استعمار کے خلاف جدوجہدِ آزادی کے دوران موجود نہیں تھے، یا جو اس وقت عالمِ خارج میں تھے اور اب ہمارے باطن کا جز بن چکے ہیں۔ اس میں شک و شبے کی کوئی گنجائش نہیں کہ آزادی کے بعد نشر و اشاعت کے وسائل میں خاصی توسیع ہوئی ہے، لیکن توسیع کے ساتھ اتنی ہی، یا اس سے زیادہ، تخدید بھی ہوئی ہے۔ اسی طرح اکثر نوآزاد ممالک میں ادب اور دوسرے فنونِ لطیفہ کی سرپرستی کے لیے بہت سے ادارے، رسمی طور پر قائم کیے گئے ہیں۔ ان کی کوئی سیاسی افادیت ہو تو ہو، لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ تہذیبی میدان میں ان کے وجود اورکارکردگی سے کیا فرق پڑا ہے؟ کم ازکم اردو ادب کی تخلیق کے سلسلے میں ان اداروں کا کوئی واضح کردار سامنے نہیں آیا، ماسوا نیک تمناؤں اور بلند بانگ اعلانات کے۔

درحقیقت، سرکاری سطح پر، علمی ادبی اداروں کا وجود ہی اس بات کا شاہد ہے کہ ہم تہذیبی سطح پر خود استعماریت کے دور سے گزر رہے ہیں۔ عام طور پر ان کی وجہِ جواز یہ بتائی جاتی ہے کہ علم و ادب کے میدان میں سرکاری سرپرستی کے بغیر گذارا ممکن نہیں، اس لیے کہ غیرسرکاری اداروں یا تہذیبی نوعیت کا کام کرنے والے افراد کے پاس ایسے ذرائع موجود نہیں ہوتے جن کی مدد سے کوئی دور رس قسم کا اجتماعی منصوبہ کار عمل میں لایا جا سکے۔ لیکن سرکاری سرپرستی حاصل کرنے سے پہلے کوئی ادارہ موجود تو ہو، یا پھر تہذیبی نوعیت کا کام کرنے والے افراد کے درمیان کوئی آزاد رشتہ قائم کرنے کی صورت پیدا کی جائے۔ اس کی بجائے ہمارے یہاں جو بھی علمی ادبی ادارے وجود میں لائے گئے ہیں، سرکاری محکموں کے طور پر، یا سرکاری محکموں کی زیرِ نگرانی کام کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور لامحالہ خود ایک بیوروکریسی بن جاتے ہیں، ایک ایسی بیوروکریسی جو سرکاری بیوروکریسی سے زیادہ بیوروکریٹک ہو۔

چنانچہ "خود استعماریت" کا سب سے بڑا مظہر تہذیبی بیوروکریسی کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ ادیب وہ ہے جس کا نام کسی سرکاری فہرست میں لکھا ہو، چاہے اس نے کبھی کچھ لکھا ہو یا نہیں۔ شاعر وہ ہے جس کا کسی نشریاتی ادارے سے معاہدہ ہو چکا ہو، نہ کہ وہ جس کی تصانیف پڑھی اور پسند کی جاتی ہوں۔ کوئی لکھنے والا ملک گیر شہرت کا حامل ہو یا بین الاقوامی سطح پر تسلیم کیا جا چکا ہو، اسے ہمارے سرکاری ادارے جب چاہیں غیرموجود بنا سکتے ہیں، اور جب چاہیں بحال کر سکتے ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہےکہ سرکاری صورتِ حال بدلنے کے بعد ادبی صورتِ حال میں بھی کچھ نہ کچھ تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے، تاہم اس تبدیلی

Scanned with CamScanner

سے علمی ادبی اداروں کی نوعیت میں کوئی بنیادی فرق نہیں پڑتا۔ کچھ لکھنے والوں پر سے پابندی اٹھ جاتی ہے اور ان کی جگہ کچھ دوسروں پر لگ جاتی ہے۔ نئی تمنائیں اور نئے دعوے جنم لیتے ہیں لیکن ان کی پیش کش کا وہی پرانا تبلیغاتی انداز برقرار رہتا ہے۔ چند ایک تہذیبی بیوروکریٹ بدل جاتے ہیں لیکن بیوروکریسی قائم و دائم رہتی ہے۔

۳

تعلیم کے میدان میں، جس کا ادب کی تخلیق اورترویج دونوں سے گہرا تعلق ہے، یہ تو محسوس کیا گیا ہے کہ استعماری دور کا نظام آزادی کے بعد تبدیل ہونا چاہیے، اوراسے بعض ملکوں میں بڑی حد تک متعدّد مرتبہ بدلا بھی گیا ہے، لیکن نئی تعلیمی حکمت عملی کے لیے نئے مقاصد وضع کرتے ہوئے نئے دور کی فکری ضرورتوں کا خیال بہت کم رکھا گیا ہے۔ زیادہ تر تبدیلیاں جو روا رکھی گئی ہیں، یا تو بےضرورت تھیں، یا محض ظاہری تھیں اور ہنگامی سیاست کی پیداوار۔ ایسی صورت میں تعلیم کے روزمرہ وظائف، یعنی درس و تدریس، تربیتِ اساتذہ، نصابی کتب کی تیاری اور اہلیتوں کی آرزیابی، کا معیار کیسے متاثر نہ ہوتا؟ پھر سائنسی اور تکنیکی تعلیم کی ضرورت کا ڈھول اس زور و شور کے ساتھ پیٹا گیا کہ بشری علوم اورزبانوں کی تعلیم سے معاشرے کی توجہ بالکل ہٹ گئی (یہ الگ بات کہ سائنس کی تعلیم بھی فکری سطح پر استوار نہ ہو سکی)۔ اب ایسے میں ادب کی تعلیم تہذیبی اور دانشورانہ تناظر سے بےنیاز ہو گئی۔ چنانچہ تیسری دنیا کے متعدّد نوآزاد ممالک میں یہ شکایت عام طور پر سنی گئی کہ آزادی کے بعد نہ غیرملکی زبانوں میں تحصیل کا معیار قائم رہ سکا، نہ ملکی اور قومی زبانوں کی طرف کوئی زوردار توجہ دی جا سکی۔ اس طرح نئی نسل کے طلبا میں اپنے تہذیبی سرمائے کی طرف رغبت میں بھی کوئی اضافہ یا گہرائی پیدا نہیں ہوئی۔

تخلیقِ ادب کے لیے تعلیم ادب کی اہمیت بالعموم تسلیم نہیں کی جاتی، اس دلیل کے ساتھ کہ تعلیم ایک رسمی سرگرمی کا کام ہے جب کہ ادب غیررسمی نہ ہو تو کچھ بھی نہیں۔ اب اس میں تو کوئی شک نہیں کہ یونیورسٹیوں، کالجوں اور سکولوں میں دی جانے والی تعلیم زیادہ تر رسمی قسم کی ہوتی ہے اور وہ بھی اس وقت جب کہ یہ ادارے واقعتاً کام کر رہے ہوں، جو کہ تیسری دنیا میں بہت کم ہوتا ہے۔ لیکن کسی بھی تہذیب میں رسمی تعلیم، حقیقی تعلیم کا محض ایک حصہ ہوتی ہے، چاہے کتنا بھی ضروری حصہ کیوں نہ ہو۔

ہر زندہ معاشرے میں ایسے تہذیبی ادارے وجود رکھتے ہیں جو، بالواسطہ یا بلاواسطہ، ادب کی غیررسمی تعلیم فراہم کریں۔ محفلیں، اجتماعی سرگرمیاں، ادیبوں اور فنکاروں کا عام لوگوں سے میل جول اور آپس میں ربط و ضبط کے مواقع، تازہ واردانِ ادب کا بزرگانِ ادب سے مکالمہ، اور سب سے زیادہ معاشرے میں ایسے دانشوروں کا وجود جو ہماری تہذیبی اقدار کے ترجمان بھی ہوں اور تہذیبی وقار کے پاسبان بھی، یہ سب مظاہر ہماری زندگی سے کاملاً رخصت نہیں ہوئے تو نظروں سے اوجھل ضرور ہو چکے ہیں۔ یہاں تک کہ برصغیر کی تہذیب نے جو ایک منفرد ادارہ

مشاعرے کی شکل میں ترتیب دیا تھا، آزادی کا زمانہ آنے تک زوال کی آخری حد کو چھو چکا تھا اور اب اس کے آحیا اور تجدید کی جو کوشش برصغیر سے باہر خلیجی اور مغربی ممالک میں آباد برّصغیر کے لوگوں نے شروع کی ہے، اس سے محض ان کی تہذیبی پیاس کا پتا چلتا ہے، شاید یہ جاننے کی ضرورت ابھی محسوس نہیں ہوئی کہ اس پیاس کی تسکین کس سطح پر ہوتی ہے۔

غرض کہ ادب کی غیررسمی تعلیم کے ذرائع یا تو مفقود ہو گئے یا تہذیبی سطح پر غیرموثّر بنا دیے گئے۔ پھر رسمی تعلیم کے اداروں نے بھی اس خلا کو پُر کرنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی، نہ مغرب کی طرح ذرائع ابلاغ کا صنفی اور تخلیقی استعمال آزادی کے ساتھ ممکن ہوا۔ چنانچہ آج ہمیں نوجوان شاعروں کے کلام میں جب کوئی ٹکڑا آہنگِ شعر سے آکھڑتا ہوا سنائی دیتا ہے تو خفا ہونے سے پہلے یہ سوال کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ہماری رسمی یا غیررسمی تعلیم نے کس نوجوان کو آہنگِ شعر سے آشنائی پیدا کرنے کے کتنے اور کون سے مواقع فراہم کیے ہیں؟ عروض کی تعلیم اور شعرخوانی کی تربیت نہ صرف یہ کہ ہمارے مدارس میں نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے بلکہ ادب پڑھانے والوں کی شان میں گستاخی نہ ہو تو یہ کہنا بھی کچھ ایسا غلط نہ ہو گا کہ یونیورسٹی تک کی سطح پر کم ہی کوئی استاد میر، غالب یا اقبال کے مشہور اشعار کو کسی تغیّر و تبدّل یا الفاظ کی تقدیم و تاخیر کے بغیر سنانے پر قادر ملے گا۔ ایسے میں ہم کسی نوجوان کہنے والے کو کس منہ سے الزام دیں؟

ممکن ہے رائج الوقت تعلیمی معیار سے ناواقف حضرات کو اس بات میں مبالغے کی بُو آئے یا وہ ہمت کر کے یہ کہہ دیں کہ اس سے کیا فرق پڑتا ہے؛ لیکن اتنا ضرور مان لینا چاہیے کہ جب ادب کی تعلیم کا انحصار صرف و محض رسمی تعلیم کے اداروں پر ہو تو اس کے معیار کا بہت بہتر ہونا اور اس کے طریقِ کار کا رسمی انداز سے مختلف ہونا لازم ہو جاتا ہے۔

جہاں تک اپنے ادبی سرمائے اور اس کے بنیادی عناصر سے رغبت پیدا کرنے کا تعلق ہے، تو یہاں بھی ہمارے تعلیمی نظام اور تعلیمی اسٹیبلشمنٹ کا طرزِ فکروعمل مبہم نظر آتا ہے۔ وہ یہ تو نہیں کہتے کہ ہمارا کوئی تہذیبی سرمایہ ہی نہیں، لیکن وہ اس تمام ذخیرے کی محض فہرست بنا کر رہ جاتے ہیں اور اس سرمائے سے ہمیں فیض یاب کرنے کی بجائے مرعوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر اس کی تعریف و توصیف ایسے کلمات سے کرتے ہیں کہ کسی بھی کلاسیکی کمال میں کوئی تخصیص پیدا نہیں ہوتی، اور ایک سے دوسری تحریر میں کوئی امتیاز محسوس بھی ہو تو یہی کہا جاتا ہے کہ اپنے اپنے زمانے کی بات ہے، اور یہ کہ ہمارے سب بزرگ اپنی اپنی جگہ احترام کے مستحق تھے اور انھوں نے جو کچھ کیا، سب ہمارا ورثہ ہے۔ ممکن ہے تہذیبی تفاخر کا یہ انداز کچھ وقتی ضروریات رکھتا ہو، لیکن جب تک ہمیں یہ نہ معلوم ہو کہ ہمارے تہذیبی ورثے کا کون سا حصّہ آج بھی ہمارے لیے کوئی معنویت اور اہمیت رکھتا ہے، اور کس لکھنے والے نے ہمارے سرمائے میں کیا خاص اضافہ کیا ہے، تو کلاسیکی دور کے جملہ کمالات، طاقِ نسیاں پر دھرے رہ جاتے ہیں، اور احترامِ عام کا جذبہ انھیں ہمارے قریب نہیں آنے دیتا۔

ممکن ہے ان سب باتوں کے باوجود کسی نئے لکھنے والے کو اہلِ مدرسہ یا اہلِ ادب میں سے کوئی آزمودہ کار استاد مل جائے، لیکن یہ امکان پھر بھی کم ہے کہ ایسی کسی شخصیت سے اس

Scanned with CamScanner

رابطہ اس کے لیے فنّی اورتکنیکی سطح پر مددگار بن سکے یا اظہار و ابلاغ کی تربیت فراہم کر
کیا اس لیے کہ ہمارے رسمی اور غیررسمی تعلیمی اور تہذیبی اداروں میں ایسی شخصیات کا
جود ہی کمیاب ہے، اور کہیں کوئی مل بھی جائے تو اپنی جگہ شکایت کناں کہ کسی کو کچھ
یکھنے کی ضرورت کا احساس ہی نہیں، ہر نیا لکھنے والا اپنی ہر کچی سے کچی تحریر کو حرفِ
ر سمجھتا ہے۔ یہ رویہ غالباً اس وجہ سے بھی پیدا ہوا ہو گا کہ مدیرانِ جرائد اور منتظمینِ
افل، اپنے حلقہ بگوشوں کی تعداد بڑھانے میں اتنے منہمک ہوتے ہیں کہ ان کا معیار بڑھانے کے
ن کے پاس کوئی وقت نہیں رہ جاتا۔

ہمارا ادبی ماحول جس قسم کی مفاد پرستانہ گروہ بندیوں کا شکار ہے اورمختلف گروہوں کے
میان، پابلو نرودا کے الفاظ میں، باہمی نفرتوں کے جو پہاڑ پھیلے ہوے ہیں، ان کی زد میں سب
ے پہلے وہ لوگ آتے ہیں جو آزاد اور غیرجانبدار رہنا چاہتے ہوں، اور وہ لکھنے والے کہ جانبین
ساتھ برابر کا رابطہ اور سابقہ رکھتے ہوں، ان کا احوال اکثر یہی ہوتا ہے؛

دل کو روؤں کہ اب جگر کو میں
میری دونوں سے آشنائی تھی

ادیبوں کے درمیان چشمک بلکہ گروہ بندی بھی کوئی نئی چیز نہیں، لیکن رشک و رقابت کے
جود ان کے درمیان صحت مند مسابقت کا رجحان بھی تو کام کر سکتا ہے، لیکن ہمارے ادبی
حول میں اس قسم کی فضا موجود ہی نہیں؛ یا تو مطلق جنگ ہے یا غیر مشروط سپر اندازی۔
طرح اپنے اپنے حامیوں سے سو فیصد غلامی طلب کی جاتی ہے، اور ذرا سی فکری آزادی کو
وفاداری کے منافی سمجھا جاتا ہے۔ تہذیبی قیادت میں ایسے رویے کو خود استعماریت کے ایک
ہر کے سوا اور کیا قرار دیا جائے؟

خود استعماریت کا بنیادی طریقِ کار ایک ایسی صورتِ حال پیدا کرنا ہے جس میں فکر و
ل کی آزادی مفقود ہو کر رہ جائے، اور کوئی لکھنے پڑھنے والا ذرا بھی مختلف قسم کی آواز نہ
ا پائے۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ "گلاس نوسٹ" کے زمانے میں بھی ہمارے یہاں ایسے لوگوں کی
ئی کمی نہیں جو اسٹالن کےاندر میں سوچتے ہوں، اور ایسے محبِ وطن تو بہت ہیں جو احوالِ
ن پر سوچ بچار کرنے والے ہر شخص پر قدغن لگوانا چاہتے ہوں۔ ان دونوں فکری یا غیرفکری،
وں کے درمیان ہر وقت ایک تناؤ، ایک کھچاؤ، ایک سرد جنگ قسم کی کیفیت موجود رہتی ہے،
ں میں کسی لکھنے والے کو یہ حق حاصل نہیں کہ ان دونوں سے لاتعلق یا غیرجانبدار رہ سکے۔
موم ایسے لکھنے والوں کو کمٹ منٹ نہ کرنے کا الزام دیا جاتا ہے۔ حالانکہ جب دونوں طرف
تعماری تسلّط کا رجحان واضح طور پر کارفرما نظر آتا ہو تو کمٹ منٹ، دونوں میں سے کسی
ے سے نہیں، کسی تیسری چیز ہی سے ہو سکتی ہے۔ آزادی اور تہذیب کے ساتھ آپ کی کمٹ
ٹ کا مفہوم ہی یہی ہے کہ آپ ذہنی غلامی اور تہذیبی اجارہ داری میں سے کسی ایک کا ساتھ
یں اور کسی قسم کی خود استعماریت کو ممکن نہ ہونے دیں۔

علی شریعتی نے استعمار کی جن دو خصوصیات کو "استحمار" یعنی خر سازی اور "استمار"
ن ثمر اندوزی کا نام دیا ہے، وہ بھی خود استعماریت کے اس تہذیبی مظہر میں پوری طرح

کارفرما ہیں، ایک ایسی ملی جلی شکل میں جسے صرف ادبی خرکاری کا نام دیا جا سکتا ہے۔

۴

اردو ادب کی تاریخ میں منشی پریم چند نے رسالوں اور کتابوں کے ناشرین کے ساتھ حقوق
اشاعت کے سلسلے میں جس کشمکش کا آغاز آج سے ساٹھ ستّر سال پہلے کیا تھا اور جس پر
بعد میں سعادت حسن منٹو نے سب سے زیادہ اصرار کیا، ہمارے زمانے میں یہ مقدّس کشمکش
سبوتاژ کا شکار ہوئی۔ اب یہ کیفیت ہے کہ ادیب کو امداد اور خیرات، وظائف اور سرپرستی
انعام اور اکرام کے طور پر کچھ مل جائے تو مل جائے، لیکن کسی ادبی رسالے میں قلمی معاونت
اور کتاب کی اشاعت سے اپنا حق طلب کرنا آج کی ادبی صورتِ حال میں گناہِ کبیرہ سے کم نہیں
اور دلچسپ بات یہ ہے کہ جن اداروں کی سربراہی سکّہ بند ادیبوں کے ہاتھ میں ہے، اور جو زیادہ
سے زیادہ اشتہارات بھی چھاپتے ہیں، وہی اپنے ادیب ساتھیوں کے جائز حقوق کو کسی نہ کسی
بہانے نظرانداز کرتے ہیں۔

آزادی سے پہلے ادبی کتابوں کی اشاعت کا جو نظام پیدا ہوا تھا، آزادی کے بعد دیر تک نہ چل
سکا۔ ظاہر ہے کہ اس میں بہت سی خرابیاں تھیں، لیکن ماضی قریب کے سنہری مواقع اورترغیبات
کے سامنے تو یہ نظام پوری طرح فاسد اور بالآخر ناکارہ ہو کے رہ گیا۔ اب جو ہمارے یہاں ادبی
کتابوں کی اشاعت ہوتی ہے، چند ایک بردل عزیز مصنّفین کو چھوڑ کر، جن کی تعداد کوئی زیادہ
نہیں، بہت کم آزادانہ ہوتی ہے۔ بلکہ اگر ناشر سے مراد کوئی ایسا آدمی ہو جو پیش قدمی کر کے
ادیبوں سے کسی طے شدہ معاہدے کے مطابق مسوّدات حاصل کرے، کتاب کی اشاعت پر سرمایہ
لگائے اور اس کی فروخت کے ذریعے اپنے بال بچوں کے لیے روزی پیدا کرے، تو ایسی مخلوق کم از
کم ہمارے یہاں تقریباً مفقود ہو چکی ہے۔

مفروضہ شاید یہ ہے کہ اگر آپ اپنی کتاب شائع کرانا چاہتے ہیں تو یہ تکلیف چونکہ آپ کو
ہوئی ہے، لہٰذا اس کے لیے وسائل بہم پہنچانا بھی آپ کی ذمّے داری ہے۔ ہمارے زمانے میں ادبی
کتابوں کی خاصی بڑی تعداد اسی مفروضے کی بنیاد پر شائع ہوتی ہے۔ اگر کوئی پوچھے کہ حقوق
اشاعت کیا ہوئے، تو شاید کسی ظریف کا قول پیش کرنا پڑے گا کہ آج کل یہ حقوق، ادیب کی
طرف سے ناشر کو واجب الادا ہوتے ہیں۔ چنانچہ ادبی نشر و اشاعت کا میدان بڑی حد تک ان
ادیبوں کا مرہونِ منّت ہو چکا ہے جو کہیں نہ کہیں سے اس کا انتظام کر سکیں۔ شاید وہ دن دور
نہیں جب کسی ادیب کو مصنف بننے سے پہلے کوئی نہ کوئی واردات کرنی پڑے گی، کہ اس سے ذرا
کمتر قسم کے کام تو اب معمول بن چکے ہیں۔

اردو میں ادبی کتابوں کی اشاعتی مشکلات کے حل کا ایک طریقہ وہ بتایا جاتا ہے جو
ہندوستان میں اختیار کیا گیا ہے۔ وہاں زیادہ تر نقدِ ادب اور تحقیق اور بعض اوقات تخلیقی ادب
کی نئی تصانیف صوبائی اورمرکزی حکومتوں کی گرانٹ سے چلنے والے متعدّد اداروں کی امداد اور
تعاون سے شائع ہوتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان میں سے اکثر اس کے بغیر شائع نہ ہو

Scanned with CamScanner

سکتیں، اور ان میں سے بعض کی اشاعت مستحسن قرار دی جا سکتی ہے؛ تاہم ان میں اکثر کا نقطۂ نظر سیاسی سطح پر مفید، یا کم از کم محفوظ، سمجھا جائے، تبھی ان کی اشاعت ممکن ہو گی۔ علمی اورتنقیدی کتابوں سے زیادہ اس کا نقصان تخلیقی ادب کو پہنچے گا۔

لیکن کتابوں کی طباعت محض ایک معاشی مسئلہ نہیں، ایک تہذیبی مسئلہ بھی ہے۔ کسی کتاب کے چھپ جانے سے بات ختم نہیں ہو جاتی، نہ رونمائی کی تقریب کا انعقاد اوراس کی خبر چھپوانے سے کوئی دیرپا مقصد پورا ہو سکتا ہے۔ اصل چیز تو معاشرے میں اس آواز کا اثر و نفوذ ہے جو لوگوں تک پہنچائی جا رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی کوئی آواز ہر نئی تصنیف میں تو موجود نہیں ہوتی، پھر بھی اس کا فیصلہ آزادی کے ساتھ پڑھنے والوں کے ذریعے ہوتو بہتر ہے۔ لیکن بہت سی کتابوں کی پڑھنے والوں تک رسائی نہیں ہوتی اور بہت سے پڑھنے والوں کی کتابوں تک۔ یہاں کتابوں کی تقسیم اور فروخت کا نظام بھی سامنے رکھنا ہو گا، خواندگی کے تناسب کا بھی اور اس معاشرتی مظہر کا بھی جسے "خواندہ لوگوں کی ناخواندگی" کہا جا سکتا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ برقیاتی وسائل کے زمانے میں کتاب کا چلن ویسے ہی کم ہو گیا ہے، لیکن یہ بات ان ملکوں کے بارے میں درست نہیں جہاں برقیاتی وسائل ہم سے کہیں زیادہ مقدار میں اور کہیں زیادہ پُرکشش انداز میں دستیاب ہیں۔

واضح طور پر یہاں وہ مشکل بھی حائل ہے جسے ہندوستان کے مزاح نگار مجتبیٰ حسین نے اپنے مضمون "اردو ادب کا آخری قاری" میں پیش کیا ہے، اور جو، مزاح ایک طرف، معاصر ادب کا ایک بنیادی تہذیبی مسئلہ بھی ہے۔ ممکن ہے بعض لوگ چند ایک خوشنما اوراشتہاری قسم کی کتابیں خرید کررکھ لیتے ہوں، مگر آج کتنے لوگ اپنے دور کا اردو ادب پڑھتے ہیں، اور کس صورت میں، اس سوال کا جواب کسی نہ کسی ادارے کو معلوم کرنا چاہیے۔

بات اس سے بھی آگے جا سکتی ہے، مگر فی الحال اسے یہیں تک محدود رہنے دیجیے، کہ صورت حال اتنی مخدوش ہو اور دیر تک یہی معمول بن جائے تو پھر لکھنے والے لکھیں کے ہی کیوں؟ اوّل تو یہی محلِ نظر ہے کہ جنھیں لکھنے والے کہا جا سکتا ہے، وہ سب اس دور میں لکھ رہے ہیں، اور لکھ رہے ہیں تو ان کی آواز پہنچ بھی رہی ہے؛ بہر حال چند ایک لکھ بھی رہے ہوں، تب بھی لکھنے کاکام اس وقت تک ایک تہذیبی قوت نہیں بن سکتا جب تک ادیب کو معاشرے کا تعاون حاصل نہ ہو۔ گویا ہم گھوم پھر کر وہیں پہنچ جاتے ہیں جہاں سے بات چلی تھی۔

ظاہر ہے کہ اس دائرۂ شر کو صرف ادیب ہی توڑ سکتا ہے؛ ممکن ہے وہ کامیاب نہ ہو پھر بھی کشمکش اسی کو کرنی ہے۔ تہذیبی نوعیت کا کوئی اکیلا کارنامہ ہتھیلی پر سرسوں نہیں جما سکتا، نہ تہذیبی کارگزاریوں کا فیصلہ سرسری سماعت کے ذریعے ممکن ہے، پھر بھی جو لوگ تخلیقِ ادب میں مصروف ہوں انھیں اپنے سفر کے آخر میں پورے اعتماد کے ساتھ اتنا کہنے کے قابل ضرور ہونا پڑے گا:

گو نالہ نارسا ہو، نہ ہو آہ میں اثر
میں نے تو درگذر نہ کی، جو مجھ سے ہو سکا

اردو کے منفرد ادیب
محمد خالد اختر
کی اوّلین تصنیف
بیس سو گیارہ
کا نیا ایڈیشن بہت جلد شائع ہو رہا ہے

نسرین انجم بھٹی
کی اردو نظموں کا پہلا مجموعہ
بہت جلد شائع ہو رہا ہے

سعیدالدین
کی نظموں کا پہلا مجموعہ
رات
بہت جلد شائع ہو رہا ہے

Scanned with CamScanner

زوجین

یہ زوج ترا گھر تھی
تو نے جو نظر پھیری
اک گنبدِ بےدر تھی

گنبد میں اندھیرا ھے
اندر کی دراڑوں میں
ناگوں کا بسیرا ھے

اس کاسۂ سر سے گر
تم کان لگاؤ گے
ھنگامہ وہ برپا ھے
کچھ بھید نہ پاؤ گے

ٹکراتا ھے سر کوئی
ھنستا ھے ادھر کوئی
اک طفل کا آوازہ
بےسوز کوئی باجا
تھرّاتی اذاں پیہم
آوازِ سکاں پیہم
جھرنا سا رواں پیہم

rekhta

Scanned with CamScanner

جھرنے کی روانی میں
اک زوج نہاتی ہے
ہر چاند کا خوں مَل کر
تن اپنا سجاتی ہے
جب جوش میں آتی ہے
گنبد میں بلاتی ہے

گنبد تو مگر بےدر
جائے نہ صدا باہر
آتے ہو ادھر ڈر کر
کیا یہ تھا تمہارا گھر

نیند کے سرمئی دھندلکوں میں
ڈوب جاتے ہیں رُونھتے مَنتے

کسی دریا میں کوئی ساکت ناؤ
جسم و جاں کا رکا رکا سا بہاؤ

وہی مقسوم بسترِ زوجین
ایک پہلو میں پھول ایک میں گھاؤ

جب ہے اک خواب زندگی ساری
تیری بےمہریاں بھی ہوں گی خواب
فرش پر گر گیا یہی کھاتا
درج تھا جس میں زندگی کا حساب

بےخیالی میں تھامتی ہوں ہاتھ
سوتے سوتے خیال آتا ہے
رات ہے اور ساتھ ہے تیرا
تا بہ کَے اس کی میں کروں تکذیب

پس تو پھر شکرِ ربِ ارض و سما
حکم سے جس کی ابر اٹھتا ہے
شکر اس روز کا عطا جو ہوا
اور اس رات کا جو آئی ہے
تجھ کو لے کر گھٹا کی بانہوں میں
سرمئی نیند کی پناہوں میں

باراں کی شب کھوتے رہے
ہم تن بہ تن، ہم رو بہ رو
برسات میں سوتے رہے

جیسے رواں تھا قافلہ
بیداریوں کی ریگ پر، بےگانگی کے خواب کا

جب کسمسائی تھی زمیں
جب سنسنائی تھی ہوا
جب شور بارش کا بڑھا
عریاں عناصر میں گھرے
جاں سینچتی بوچھاڑ میں
ہم خشک جاں، ہم خشک تن
شکووں بھرے دو مرد و زن
تھامے تذبذب کی ردا
کر کے بہانہ نیند کا
اک خواب میں روتے رہے
برسات میں سوتے رہے

مرے مرد نے رات اک خواب دیکھا
عجب دہشت آسا
کہ وہ جاگ کر دم بخود رہ گیا
خشک اور گرم سانسوں کو گنتا رہا

rekhta
Scanned with CamScanner

پیاس اپنی دبائے
یہاں تک کہ اس کے بدن کے تناؤ نے مجھ کو جگایا

کہ میں جاگ کر دم بخود رہ گئی
خشک اور گرم سانسوں کو گنتی رہی
اس کے خوابوں کا آسیب دل میں سمائے
یہاں تک کہ میرے بدن کے تناؤ نے اس کو جگایا

سو پھر ہم اٹھے
اور اندھیرے میں بچّوں کے تن کو ٹٹولا
اور اک کوزہ بھر آب آپس میں بانٹا
ابھی رات کے کچھ پہر بچ رہے تھے
سو پھر اس کی پسلی میں داخل ہوئی میں
گزرتا ہوا سرخ سیلاب دیکھا
مرے مرد نے رات اک خواب دیکھا

جب تو نہ پُتلی میں رہا
میری طرف بڑھنے لگا
آئینہ رُو دیوانہ پن

اک اک قدم، دو دو قدم
آئینہ رُو دیوانہ پن

خندِ فحش لب پر لیے
مذموم اشارے بھاؤ میں
اور عقب میں غولِ سگاں

بےداغ تھی چادر مری
اور اس کے پیڑو پر بندھی
میرے بدن کی دھجّیاں

اب کیا کروں، پیچھے ہٹوں
آگے بڑھوں، اس سے ملوں

اب کیوں مجھے آواز دو
اب ہم کہاں اور تم کہاں
جس سمت اٹھی ہے نظر
آئینہ خانہ ہے جہاں
آئینہ رُو دیوانہ پن

rekhta
Scanned with CamScanner

عذرا عباس

نظمیں

نیند میرے کندھوں پر ٹوٹ رہی ہے

والٹر فرنانڈیز نے دوسری منزل سے چھلانگ لگا دی
اس کا اگلا حصہ ٹوٹ پھوٹ گیا

میں والٹر فرنانڈیز کو نہیں جانتی
وہ میرے فلیٹس میں ہی ۶ میں رہتا ہے

نیند میرے جسم کو لبدا کیے ہوئے ہے

والٹر فرنانڈیز شراب سے چُور تھا
اس نے اپنی ماں کو مارا
اور حکومت کی پالیسیوں کو
نفرت سے بھری گالیاں دیتے ہوئے
خودکشی کر لی

نیند میری ٹانگوں میں پھنس گئی ہے

rekhta

Scanned with CamScanner

عذرا عباس

نظمیں

نیند میرے کندھوں پر ٹوٹ رہی ہے

والٹر فرنانڈیز نے دوسری منزل سے چھلانگ لگا دی
اس کا اگلا حصہ ٹوٹ پھوٹ گیا

میں والٹر فرنانڈیز کو نہیں جانتی
وہ میرے فلیٹس میں ہی ۶ میں رہتا ہے

نیند میرے جسم کو لبدا کیے ہوئے ہے

والٹر فرنانڈیز شراب سے چُور تھا
اس نے اپنی ماں کو مارا
اور حکومت کی پالیسیوں کو
نفرت سے بھری گالیاں دیتے ہوئے
خودکشی کر لی

نیند میری ٹانگوں میں پھنس گئی ہے

کوئی گھنٹی بجا رہا ہے
باہر شور مچا ہوا ہے
بچاؤ، اٹھاؤ، مرگیا
والٹر فرنانڈیز مرا نہیں
موت اسے نہیں آتی جو مرنا چاہتا ہے

رات کا ایک بجا ہے
بہت تیز گھنٹی بج رہی ہے
میں دروازہ کھولتی ہوں
مر گیا
نہیں بچ گیا
اس کا صرف منہ ٹوٹا ہے
اور گاڑی کے شیشے جس پر وہ گرا تھا

میں ٹھنڈا سانس لیتی ہوں
میں کوئی بری خبر سننا چاہتی تھی

نیند ابھی تک میرے کندھوں پر چڑھی ہوئی ہے

ایک بار تم نے مجھے
ساحلوں پر چُوما تھا

ایک بار تم نے پہلی بار
مجھے چوم کر کہا تھا
یہ اتفاق ہے

اور میں نے اس اتفاق کو اپنے ہونٹوں پر لگا رہنے دیا تھا
ایک بار اس دیوار کے پیچھے
جہاں صرف دیوار دیکھ رہی تھی
ایک بار وہاں
جہاں دھول اڑاتا ٹرک ہمارے قریب سے گزرا تھا

rekhta

Scanned with CamScanner

اور میں نے تمام چومی جانے والی لڑکیوں کی طرح
اپنے ہونٹوں کو تمہارے سپرد کر دیا تھا

ایک بار جب تمہاری جیب میں
کسی دوسرے کے ہونٹ رکھے ہوئے تھے
میں نے اپنے ہونٹ تمہاری جیب میں رکھ دیے
اور وہ دوسرے لگا لیے
میں آج تک دوسرے ہونٹوں کے ساتھ پھرتی ہوں
میرے ہونٹ تمہاری جیب میں پڑے ہیں
تمہاری جیب آج تمہارے پاس نہیں ہے
لوگ کہتے ہیں
تم آج تک اپنی جیب ڈھونڈ رہے ہو

ہر دن میں تمہارے اور اپنے درمیان ایک اینٹ رکھ دیتی ہوں
اینٹ کے اوپر دوسری اینٹ
میرے پاس بجری اور سیمنٹ نہیں ہے
ارادہ بھی نہیں
بس اینٹیں ہیں
میں اینٹیں تلے اوپر رکھتی جاتی ہوں

تم مجھ سے ذرا دور ایک کرسی پر بیٹھے ہو
صبح کی دھوپ سے منہ اُدھر کر کے
جہاں سمندر نہیں ہے
بارش نہیں ہے
دھوپ نہیں ہے

اگر تمہارے اور اپنے درمیان
ان تمام اینٹوں کی دیوار بنا لوں
تو تمہارے حصے میں
سمندر، دھوپ اور بارش نہیں آئے گی

پھر دھوپ
تمہاری پیٹھ پر بھی نہیں گرے گی

تم پلٹ کر دیکھو گے
تو وہ دیوار بھی نہیں ہو گی

Scanned with CamScanner

نظموں کے منتخب حصّے

۱۵

تمہارا روٹھنا اچھا لگا مجھ کو
یہاں دریا تھے
جو روتے ہوے شہروں کے آنسو پونچھ لیتے تھے
یہاں جنگل تھے
جن میں دھوپ سایوں کی عیادت کے لیے ہر روز ننگے پیر آتی تھی
یہاں تارے تھے
جو کھوٹی ہوئی نظموں کو مل کر لوٹ لیتے تھے
یہاں قصبے تھے
جن میں مسکراہٹ اور اشکوں کے قبائل ساتھ رہتے تھے
یہاں لہریں تھیں
جن کو کھیلنے ہی سے کبھی فرصت نہ ملتی تھی
یہاں چھاگل تھی
جس کو پیاس کے سائے سے نفرت تھی
یہاں اک دل تھا
جس کا ٹوٹنا اچھا لگا مجھ کو

Scanned with CamScanner

۱۸

خشک پتّے پانی کی تلاش میں فٹ پاتھوں پہ گھوم رہے ہیں
(یہ بلّی میری آنکھوں کے پیالے توڑ ڈالے گی)
اس سڑک کے ہاتھ کب تک خالی رہیں گے
(یہ بلّی میری آنکھوں کے پیالے توڑ ڈالے گی)
دن نے رات کے کمرے میں آ کر لائٹ آف کر دی ہے
(یہ بلّی میری آنکھوں کے پیالے توڑ ڈالے گی)
سمندر ابھی تک ورزش کر رہا ہے
(یہ بلّی میری آنکھوں کے پیالے توڑ ڈالے گی)
محبت نے اسی کھڑکی سے چھلانگ لگائی تھی
(یہ بلّی میری آنکھوں کے پیالے توڑ ڈالے گی)
دھوپ مونگ پھلیاں کھانے کے شوق میں ایک ریڑھی پر بیٹھ کر چلی گئی
(یہ بلّی میری آنکھوں کے پیالے توڑ ڈالے گی)
محبت آنسو گیس سے بچنے کے لیے اندر آئی تھی
(یہ بلّی میری آنکھوں کے پیالے توڑ ڈالے گی)

۷

مجھے تاروں کا تنہا جاگنا اچھا نہیں لگتا
تم اپنی خواہشوں کے تنگ پاجامے کو اک دن پھاڑ ڈالو گے
خدا بھی اپنی خاموشی کے بندھن توڑ سکتا ہے
مگر ان انگلیوں کا نیند سے کیسے تعارف ہو
مجھے یہ بند کھڑکی کھول لینے دو
محبت کی الف بے سیکھنے میں وقت لگتا ہے
تم ان سڑکوں کو تنہائی کے بستر سے اٹھا دو گے
مجھے بھی آگ سے ملنے کا کتنا شوق تھا پہلے
گیا تو تھا مگر مٹّی نے اپنے گھر کا دروازہ نہیں کھولا
میں ان لمحوں کا گلدستہ تمہارے گھر پہ چھوڑ آیا
تم اپنے شہر کے دروازے کب تک بند رکھو گے

۱۴

یہاں محبت کے اشتہار میں آؤ
یا کسی دھوپ رنگ کار میں آؤ
اس طرح مَیں نہیں ملوں گا تمہیں

۵۰

مجھ سے ملنا ہو تو قطار میں آؤ
یہ مرے گیت ساتھ لے جانا
تاکہ تم بھی کسی شمار میں آؤ
جیب خالی ہے ذہن خالی ہے
ایک شب کے لیے ادھار میں آؤ

۱۷

ایک لڑکی جو رات آئی تھی
یہ اُداسی وہ ساتھ لائی تھی

۱۹

نیند سے گر ہو ملاقات
تو کہنا کہ کوئی پوچھ رہا تھا
اور ہاں دیکھو
رات کی جانب ہو کبھی جانا
تو اسے یاد دلا دینا
کہ ایک وعدہ کیا تھا اس نے

۱

خدا نے مجھے ناپسندیدہ شخصیت قرار دے کر زمین سے نکل جانے کا حکم دے دیا ہے

۳

یہ کہانی یہاں سے چلتی ہے
اس کی محبت تو ناخنوں میں جمے ہوئے مَیل کی طرح ہے
جسے کہیں بھی کھرچ کر صاف کیا جا سکتا ہے
تم پوری زندگی اس نظم کے سرہانے بیٹھ کر نہیں گزار سکتے
اسے بڑی مقدار میں خواب آورگولیاں کھلا دو

۴

یہ کہانی یہاں سے چلتی ہے
میں نے سوچا تھا کہ پھولوں کے لفافے میں اسے خط بھیجوں
دھوپ کو کیسے سمندر میں کوئی غرق کرے

rekhta

Scanned with CamScanner

جس نے اپنی سبز چادر اتار کر فٹ پاتھ پر پھینک دی ہے
مسکراہٹ کی خالی پلیٹوں سے میرا پیٹ نہیں بھر سکتا
سمندر کے پاس خشک دریاؤں سے ملنے کے لیے وقت نہیں ہوتا
تم ہتھیلیوں کی نرم گھلتی ہوئی زبان سے ناواقف ہو
تم نے میرے ناخنوں میں کیلیں ٹھونک دی ہیں

۳

صبح کا ہاتھ ہے پھر رات کے دروازے پر
کسی کھڑکی سے وہ آواز نہیں جھانکے گی
ہم یونہی خوابوں کے کشکول لیے بیٹھے ہیں
گر تو جائے گی یہ آفاق کی دیوار مگر
اس طرف بھی یہی دن رات کا چکر نہ ملے
یہ جہاں باپ سے ورثے میں ملا ہے مجھ کو
میں کسی روز تجھے تجھ سے جدا کر کے چلا جاؤں گا
ہاں محبت کو تو ہر شخص برا کہتا ہے
اتنے رستے تھے کسی نے بھی نہ روکا مجھ کو

۵

میں یہاں ایک بن بلایا مہمان ہوں
درخت مروّتاً مجھے ہیلو ہیلو کہتے ہیں
دھوپ مجھے دیکھ کر عادتاً مسکراتی ہے
دریاؤں نے ستاروں کی سفارش پر مجھے اپنے کنسرٹ میں شریک کیا
زمین اپنے دسترخوان سے مجھے اٹھانا مناسب نہیں سمجھتی
پہاڑوں نے میرے کاغذات کی جانچ پڑتال صحیح طریقے سے نہیں کی
میرے پاس تمھیں دینے کے لیے اس لنگڑی مسکراہٹ کے سوا کچھ نہیں ہے

۸

وہ اپنے ہونٹوں کا جگ اٹھائے اِدھر اُدھر گھومتا رہے گا
میں التجا کے لرزتے پل پر نہ جانے کب تک کھڑا رہوں گا
وہ جانتا ہے کہ میری شاخیں سدا محبت سے اس کے سر پر جھکی رہیں گی
وہ اپنے ہونٹوں کا جگ اٹھائے اِدھر اُدھر گھومتا رہے گا
میں اس کے قدموں کی گرد سے اپنے ہاتھ مَیلے نہیں کروں گا

چاند کو بھنک پلائی ہے کسی نے شاید
میں یہاں موت سے ملنے تو نہیں آیا تھا
آسماں سے تو بھلائی کی نہ رکھو امید
یہ سمندر بھی تو دریا میں نہاتا تھا کبھی
اپنی آنکھوں سے کہو
اس طرح خواب نہ نیلام کریں

۱۱

میرے ہاتھوں نے پہلے بھی کئی دروازے کھولے ہیں
کئی سڑکوں کو یہ قصّہ سنایا ہے
کئی نارنگیوں کے باغ دیکھے ہیں
کئی دریاؤں کے گھر بار لوٹے ہیں
کئی پیڑوں کے کپڑے پھاڑ ڈالے ہیں
کئی جسموں میں اُس کا عکس دیکھا ہے

۳۱

اس نظم کے آنگن میں لیموں کا ایک خودرَو پودا اُگ آیا ہے
جس کی خوشبو تمھیں رخصت کرنے کے لیے گلی کے موڑ تک تمھارے ساتھ جائے گی
اس کی جیبیں کچّے خوابوں سے بھری ہوئی ہیں
یہ نظم بس ایک بار تمھیں چھو لینا چاہتی ہے
اس پر پہلے بھی پاگل پن کے کئی دورے پڑ چکے ہیں
یہ نظم تمھارے ہونٹوں کا جغرافیہ یاد کر رہی ہے
اس کی سڑکوں پہ کئی جلوس منتشر کر دیے گئے ہیں
اس نظم کا تمھاری آنکھوں سے کیا تعلق ہے
یہ ان ستاروں سے ہاتھ ملا کر آ رہی ہے
اب یہ تمھارے جسم کی شاہراہوں پہ آوارہ گردی کے الزام میں گرفتار ہو جائے گی

۱۴

تمھارا تصوّر شام کا پتّا توڑ کر رات پر بھونکنے لگتا ہے
رات میرے دل میں چھپ جاتی ہے
تمھارے پنجے محبت کا منھ نوچنے لگتے ہیں
محبت میرے دل میں چھپ جاتی ہے
تم معصومیت کے بغیر اس درخت کی طرح ہو

rekhta

Scanned with CamScanner

وہ اپنے ہونٹوں کا جگ اٹھائے ادھر ادھر گھومتا رہے گا
میں اس کی آنکھوں کے زرد صفحات پڑھ کے چپ تو نہیں رہوں گا
وہ اپنے ہونٹوں کا جگ اٹھائے ادھر ادھر گھومتا رہے گا

۱۰

میں نے دریاؤں کو اک نظم سنائی تھی کبھی
جیسے سورج کے گلے پر کوئی خنجر رکھ دے
جیسے گلیوں میں کسی خواب کا سہما ہوا بچہ روئے
جیسے تاروں کو کوئی دن میں جگانے آئے
میں نے دریاؤں کو اک نظم سنائی تھی کبھی

۱۱

تم میرے آنسوؤں سے گپ شپ کر کے چلے جاؤ گے
خواب کپڑوں کے بغیر زیادہ اچھے لگتے ہیں
دن ہم سے پوچھے بغیر کمرے میں گھس آئے گا
نیند پنجوں کے بل صحن میں گھوم رہی ہے
درخت پانی پلانے والوں کے نام یاد نہیں رکھتے

۱۲

یہ کہانی صندل کے درخت اپنے سامان میں باندھنا بھول گئے تھے
یہ عکس میں نے دن کے پیالے سے چرایا ہے
یہ خواب گھر جاتے پرندوں سے راستے میں بچھڑ گئے تھے
تمہارے قدموں کا یہ الیم میں نے کئی نظموں کے عوض زمین سے خریدا ہے
تم کسی پہاڑی چشمے کی خوشخبری کی طرح مجھے ملے
میں تنہا لیٹے ہوئے میدانوں سے تمہارے بارے میں کوئی بات نہیں کروں گا
بس اپنے خوابوں کو جلا کر ان کی راکھ ان پودوں کے حوالے کر دوں گا
جنھوں نے تمہاری تصویریں اٹھا رکھی ہیں

۱۳

یہ دیواریں مرے سینے پر آ کر بیٹھ جاتی ہیں
مجھے ان کھڑکیوں کے میلے چہرے زہر لگتے ہیں
یہاں سے بس یہی تصویر میرے ساتھ جائے گی
مجھے تو آگ سی اک آرزو نے مار دیا

۱۴

جب سے ان ستاروں کے سر سے سورج کا سایہ اٹھ گیا ہے
انھوں نے گھر جانا چھوڑ دیا ہے

۱۶

اس نظم نے پتھراؤ کر کے ساری کھڑکیاں توڑ ڈالیں
اب یہ کرچیاں مجھے سونے نہیں دیں گی
یہ خون تمہیں نظر آ رہا ہے
پھر وہ کود کر اندر آ گئی
"گزشتہ رات میں نے خود کو سمندر کے حوالے کر دیا، صبح اس نے مجھے نئی چوڑیوں کا تحفہ دیا۔ لو دیکھو!
ایک دن میں تمہارے پاس آ رہی تھی کہ راستے میں دھوپ مل گئی۔ میں بہت دیر تک اس کے ساتھ گلیوں میں پھرتی رہی۔ پھر وہ مجھے اپنے گھر لے گئی۔ اس نے مجھے اپنی ماں سے ملایا، اور پھر اپنے کمرے میں لے جا کر میرے ہونٹ چوم لیے۔
تم میرے چہرے کو دیکھ رہے ہو۔
ستارے مجھے اپنی داشتہ بنانا چاہتے تھے، مگر میں ان کو جُل دے کر وہاں سے بھاگ آئی۔ ان کی دست درازی کے نشان میں نے اپنے سینے میں چھپا لیے ہیں۔ رات تمہیں سب کچھ بتا دے گی"

۱۸

یہ نظم اس کی یادوں کے پناہ گزیں کیمپ کا معائنہ کرنا چاہتی ہے
یہ دروازہ اس کی آمد کی خوشی میں اپنی قمیض کے بٹن لگانا بھول گیا ہے
درختوں کے ہاتھ کانپ رہے ہیں
زمین کی نبض گم ہو گئی ہے
محبت ہمیں اس ٹھنڈے کمرے میں اکیلا چھوڑ کر نہ جانے کہاں چلی گئی

۳

لڑکیوں نے نعروں کی زبان میں کہا: اب ہمارے گھروں میں آنسوؤں کی بولی نہیں سکھائی جاتی
ہمارے پاس انہیں دینے کے لیے گجرے نہیں تھے
آخر ہم وہاں انجیر کھانے تو نہیں گئے تھے
درختوں نے ہمیں خوش آمدید نہیں کہا
زندگی نے ہم سے ملنے سے احتراز کیا

Scanned with CamScanner

رات کے پیروں سے کھیلتے خواب کئی بار تمہارے بیڈ روم کی تلاشی لے چکے ہیں
محبت کی پہلی گولی میرے سینے کے بائیں جانب لگی تھی
درخت تمہاری ہنسی کے پرندے پکڑنے میں ناکام رہے
دریا تمہاری چال بہتے بہتے جامے سے باہر ہو گئے
محبت کی دوسری گولی میرے سینے کے عین وسط میں لگی
ہوا تمہاری قمیض کی باتوں میں آ کر اپنی ساری جائیداد نیلام کرنے پر تیار ہو گئی
کرنیں تمہاری آنکھوں کی سیر کرنے کے شوق میں اپنے ماں باپ سے بچھڑ گئیں
محبت کی تیسری گولی سامنے والی دیوار میں لگی

۹

یہ تنہائی گزشتہ کئی صدیوں نے مل کر میرے اکاؤنٹ میں جمع کرائی ہے
اور محبت میں نے تمام جانے اور آنے والوں سے چوری کی ہے
یہ دکھ ستاروں نے اپنی وصیت میں میرے نام چھوڑا
اور آنسو میں نے سمندروں کے گھر پر ڈاکا ڈال کر حاصل کیے
جو خوشی مجھے ملی تھی وہ میں نے پرندوں میں بانٹ دی
اور آزادی دریاؤں نے چھین لی
میرے سارے کپڑے آگ نے مانگ لیے
اور جوتے ہوا نے پہن لیے
سورج نے میری کہانی غور سے نہیں سنی
اور بادلوں نے مجھے ورزش کرنے کا مشورہ دیا
تب یہ گونگی اور بہری بے چینی مجھے پکڑ کر تمہارے پاس لے آئی

۷

تم ایک دن میرے ہاتھوں میں گھل مل جاؤ گے
میں نے پہلے بھی کئی سیل بند خاموشیاں توڑی ہیں
درختوں سے گفتگو کے لیے پرندوں کی بولیاں سیکھنی پڑتی ہیں
تم میری زندگی کا ایک چھوٹا سا راز ہو
ایک دن میں تمہارا ہاتھ ہوا کے ہاتھ میں دے دوں گا
اور آسمان کا اتنا مذاق اڑاؤں گا
کہ وہ یہاں سے اٹھ کر کہیں اور چلا جائے گا
دن کی یہ خالی پلیٹ میری ٹیبل پر پڑی رہے گی

۳

وہ باتیں جو دریاؤں نے زمین کے خلاف کی ہیں
وہ لہریں جو گھر سے نکل کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں
وہ صدائیں جو الفاظ کی کال کوٹھڑیوں میں پڑے پڑے بوڑھی ہو گئیں
وہ راتیں جو سورج کے ناگہاں حملے کے ڈر سے رات بھر کروٹیں بدلتی ہیں
وہ فصلیں جنھوں نے مسلسل فاقوں سے تنگ آ کر زہر کھا لیا
وہ سانسیں جو ہوا سے ملاقات کرنے میں ناکام رہیں
وہ کرسیاں جن کی گود ہمیشہ خالی رہی
وہ شامیں جو بند کھڑکیوں سے ہاتھ ملا کر واپس چلی گئیں
وہ آنسو جو جلدی میں اپنا سامان ساتھ لانا بھول گئے
وہ ستارے جو اپنی سیڑھیوں سے گر کر ہلاک ہو گئے
وہ کمرے جنھیں ویرانی نے کرائے پر لے لیا ہے
وہ سڑکیں جنھیں شہری آبادی سے باہر نکال دیا گیا ہے
اور وہ آنکھیں جو خوابوں کے کسی قصبے کے چوک پر لٹکا دی گئی ہیں
سب اس کی مسکراہٹ کی ہتھیلیوں میں زندہ ہیں

۶

ایک چیونٹی میرے ہاتھ کا تفصیلی سروے کر رہی ہے
میرے ذہن میں کسی نے کئی دراز کھول کر زمین پر الٹ دیے ہیں
میں پیدائش سے بہت پہلے تمہیں جانتا تھا
یہ ساری تصویریں اسی وقت کی ہیں
یہاں تم کسی پھول کی سالگرہ میں شرکت کے لیے آئے ہوئے ہو
ہوا گھر سے آیا ہوا ٹیلیگرام پڑھ کر بےہوش ہو گئی ہے
یہاں تم ستاروں کے ساتھ بیٹھ کر خوابوں کا رقص دیکھ رہے ہو
یہ میلی چادریں تمہارے بارے میں سوچ سوچ کر دماغی توازن کھو بیٹھی ہیں
یہاں تم دریاؤں کے ساتھ کورس میں کوشی گیت گا رہے ہو
گزشتہ کئی دنوں سے اس دروازے کا منہ کھلا ہوا ہے

۷

آنسوؤں کی شکایت کرنا بیکار ہے
کسی نے میرے ذہن کے پانچویں ریکارڈ روم میں جلتا ہوا سگریٹ پھینک دیا ہے
صرف یہ چند ادھ جلے کاغذات میرے ہاتھ لگ سکے ہیں
دن کی دیواروں سے لپٹی بیلیں تمہارے جسم کے رموز جانتی ہیں

Scanned with CamScanner

رات کے پیروں سے کھیلتے خواب کئی بار تمہارے بیڈ روم کی تلاشی لے چکے ہیں
محبت کی پہلی گولی میرے سینے کے بائیں جانب لگی تھی
درخت تمہاری ہنسی کے پرندے پکڑنے میں ناکام رہے
دریا تمہاری چال بہتے بہتے جامے سے باہر ہو گئے
محبت کی دوسری گولی میرے سینے کے عین وسط میں لگی
ہوا تمہاری قمیض کی باتوں میں آ کر اپنی ساری جائیداد نیلام کرنے پر تیار ہو گئی
کرنیں تمہاری آنکھوں کی سیر کرنے کے شوق میں اپنے ماں باپ سے بچھڑ گئیں
محبت کی تیسری گولی سامنے والی دیوار میں لگی

۹

یہ تنہائی گزشتہ کئی صدیوں نے مل کر میرے اکاؤنٹ میں جمع کرائی ہے
اور محبت میں نے تمام جانے اور آنے والوں سے چوری کی ہے
یہ دکھ ستاروں نے اپنی وصیت میں میرے نام چھوڑا
اور آنسو میں نے سمندروں کے گھر پر ڈاکا ڈال کر حاصل کیے
جو خوشی مجھے ملی تھی وہ میں نے پرندوں میں بانٹ دی
اور آزادی دریاؤں نے چھین لی
میرے سارے کپڑے آگ نے مانگ لیے
اور جوتے ہوا نے پہن لیے
سورج نے میری کہانی غور سے نہیں سنی
اور بادلوں نے مجھے ورزش کرنے کا مشورہ دیا
تب یہ گونگی اور بہری بے چینی مجھے پکڑ کر تمہارے پاس لے آئی

۷

تم ایک دن میرے ہاتھوں میں گھل مل جاؤ گے
میں نے پہلے بھی کئی سیل بند خاموشیاں توڑی ہیں
درختوں سے گفتگو کے لیے پرندوں کی بولیاں سیکھنی پڑتی ہیں
تم میری زندگی کا ایک چھوٹا سا راز ہو
ایک دن میں تمہارا ہاتھ ہوا کے ہاتھ میں دے دوں گا
اور آسمان کا اتنا مذاق اڑاؤں گا
کہ وہ یہاں سے اٹھ کر کہیں اور چلا جائے گا
دن کی یہ خالی پلیٹ میری ٹیبل پر پڑی رہے گی

اپنا باقی وقت میں رات کے کوٹھے پر گزارنا چاہتا ہوں
ہاں تم کوئی ستارہ بن کر میرے ساتھ رہ سکتے ہو

۵

یادوں کی جھاڑ پونچھ کرنے والے ہاتھ ٹوٹ گئے

۷

دریا پھر کسی سفر پر نکل گئے ہیں
درختوں کو زمین میں زندہ گاڑ دیا گیا ہے
ہم ایک ہی سمت بڑھتی لہروں کی طرح ایک دوسرے میں مل جائیں گے
زمین نے شادی کے تحفے میں ہمیں یہ چٹائی دی ہے
جس کے ہر کونے میں ایک دریا سو رہا ہے
اور آسمان نے ہمیں ایک چھوٹا سا ستارہ دیا ہے
جس نے اپنی جیبوں میں بادلوں کے ٹکڑے چھپائے ہوئے ہیں
تمہاری آنکھوں میں مسکراہٹ کا ایسا پرندہ ہے
جس کی چونچ سے خواب گرتے رہتے ہیں

۸

یہ خوابوں کی فائل اٹھا کر دوبارہ الماری میں رکھ دو
آج میں کچھ نئے خواب دیکھنا چاہتا ہوں

۹

میں زندگی کے زنگ آلود گیٹ پہ بیٹھا موت کی ڈاک کا انتظار کرتا رہتا ہوں
ڈاکیا مجھے دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں کسی اور دن کا وعدہ کر کے کسی اور گلی میں مڑ جاتا ہے

اور بارش میری آنکھوں میں انگلیاں پھیرنے لگتی ہے
وقت اپنے دھوئیں سے بنے ہاتھ میری آنکھوں پر رکھ دیتا ہے
اور تم میرے ذہن کی آخری منزل سے چھلانگ لگا دیتی ہو
تنہائی کے فٹ پاتھ مجھے آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں
دن کی ٹوٹی ہوئی کشتی رات کی لہروں سے سمجھوتا کر لیتی ہے
ستاروں کے دروازے زندہ بچ جانے والوں کے لیے کھلے ہوئے ہیں

rekhta

Scanned with CamScanner

مجھے ٹوٹے ہوے لفظوں سے جوڑو
مری ان انگلیوں کو کاٹ کر پھر اس کی ٹیبل پر سجا آؤ
مجھے دوزخ کی جھولی میں گرا دو
محبّت ہو تو شعلوں کی تپش سے ڈر نہیں لگتا
مری آنکھوں کے دامن خشک کر کے اس کے دروازے پہ چھوڑ آؤ
ہوا میں اس کی سانسیں گھل گئی ہیں
مجھے ان سرد جھونکوں کے فقط دو گھونٹ پینے دو
میں پی کر گیت لکھنا چاہتا ہوں

۴

میں آہستہ آہستہ تمھیں پی رہا ہوں
ہوا کے بازوؤں میں تڑپتے درخت اور دریا کا ہاتھ چھڑا کر بھاگتی لہریں
تمھیں کچھ نہیں بتا سکتیں
میں آہستہ آہستہ تمھیں پی رہا ہوں
تمھاری بےاعتنائی اور تلخ الفاظ محبوب کے روایتی غصّے کی طرح
میرے جوتوں پہ سر رکھے سو جاتے ہیں
میں آہستہ آہستہ تمھیں پی رہا ہوں
تمھاری انگلیوں کا ذائقہ دھوپ جیسا ہے
میں آہستہ آہستہ تمھیں پی رہا ہوں
تم اپنے ہونٹ کب تک الماریوں میں رکھے رہو گے
میں آہستہ آہستہ تمھیں پی رہا ہوں
تمھاری بغلوں کے بال تمھاری پلکوں سے زیادہ خوش ذائقہ ہیں
میں آہستہ آہستہ تمھیں پی رہا ہوں

۲۲

ایک عرصے کی سوچ بچار کے بعد میں نے شاعری سے شادی کر لی
تقریب میں دیگر مہمانوں کے علاوہ ایک پاگل کتّے نے بھی شرکت کی
تقریب کے دوران اس نے ایک چاقو سے اپنا سینہ کھولا
اور اپنا دل نکال کر میری پلیٹ پر رکھ دیا
"لو اسے کچا ہی کھا لو"
پھر اس نے سب کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوے کہا
"اب یہ شادی کامیاب رہے گی"

۶۰

۳۳

یہ وہ نظمیں ہیں
جنھیں گندی نالیوں نے اپنا منھ بند رکھنے کے وعدے پر خرید لیا تھا
لیکن ہمدردی کے دو بول کسی کی زبان کھولنے کی مناسب قیمت ہے
میں نے پوری قیمت نقد ادا کی
اور ان نظموں کو اپنے گھر لے آیا
لیکن غیریقینی مستقبل کا خوف ان کے ساتھ چلا آیا ہے
میں زیادہ عرصے تک انھیں اپنے گھر میں بند کر کے نہیں رکھ سکتا
اس لیے میں نے دھوپ سے کہہ دیا ہے
کہ وہ کسی دن آ کر انھیں یہاں سے لے جائے

۳۴

نیند پڑوسی کے کتّے کو چپ کرانے چلی گئی ہے
رات بیزاری کے ساتھ بیٹھی اپنے دوپٹے میں پیوند لگا رہی ہے
دن نے کسی مالدار بیوہ سے شادی کر لی ہے
رات کے آنسو اس کے پرانے دوپٹے میں گر کر جذب ہو رہے ہیں

۶

میرے اندر کوئی چیز جل رہی ہے
تم مری سانسوں کی دہلیز پہ رک جاؤ گے
اتنی گرمی میں کوئی زندہ نہیں رہ سکتا
خون میں گھومتے شعلوں سے کوئی ہاتھ نہیں تاپے گا
یہی نقطہ ہے جہاں آ کے ہر اک چیز پگھل جاتی ہے
تم مرے خوابوں کے چنگل سے نہیں بچ سکتے
تم بھی اک روز پگھل جاؤ گے
میرے ہاتھ تمھیں کئی نئی بولیاں سکھا دیں گے
میرے ہونٹ تمھارے جسم کے تفصیلی دورے کی تیاریوں میں مصروف ہیں
یہ پھول گلدانوں سے کوئی بات نہیں کریں گے

۱۰

آنسو تمھاری تصویریں جمع کر رہے ہیں
ان کتابوں کے اعضائے تناسل کٹے ہوے ہیں، تمھاری کوکھ کبھی ہری نہیں ہو گی

Scanned with CamScanner

اس دکھ نے گزشتہ کئی دنوں سے اپنے پیٹ پر پتھر باندھ رکھے ہیں
خون پینے کے نئے طریقے سیکھنے کے لیے مچھروں کو بیرون ملک بھیجا جاتا ہے
محبت کو یہاں پہلے بھی کوئی نہیں پوچھتا تھا
میرے جسم کے کئی حصے تم سے اندھیرے میں ملنا چاہتے ہیں
درخت کسی ضروری کام سے بھی اپنی جگہ چھوڑ کر نہیں جا
سکتے
آسمان ستاروں کے باپ کی جاگیر نہیں ہے
بادلوں نے سورج کے خلاف پھر بغاوت کر دی ہے
تمھاری آواز میری روح کی جلتی لکڑیوں پر قطرہ قطرہ گر رہی ہے
زندگی کسی ٹوٹے ہوئے بال کی طرح بےگھر اور بےقیمت ہے
اس غم نے میری پسلیوں میں گھونسلا بنا لیا ہے
گھاس کے چند بےوقوف تنکوں کی تسلّی جینے کے لیے کافی نہیں
تم میرے ذہن کی بنجر زمین کو اپنے قہقہوں سے آباد کر دو گے
محبت ناخنوں کے راستے میرے اندر داخل ہوئی
تمھاری کل والی مسکراہٹ ہر لحاظ سے فیصلہ کن تھی
اب اس شہر کی چابیاں تمھارے پاس رہیں گی
میری انگلیوں کی ہر پور تمھاری خوشبو میں شرابور ہے
میرے ہاتھ کی ہر لکیر پر تمھارے دستخط ہیں
تم نے بغیر کچھ دیے مجھے حاصل کیا
میرا دل ایک ایسا پیالا تھا جس کی تہہ میں بےتوجّہی کی گرد جمی ہوئی تھی
تم نے اسے اٹھا کر اپنے ہونٹوں کے ٹھنڈے چشمے کے نیچے رکھ دیا
میری روح ایک ایسا مکان تھی جس میں ایک عرصے سے مکڑی کے جالے رہ رہے تھے
تم نے اس کے ہر کونے میں کرنوں کے گملے رکھ دیے

۱۴

صبح تمھاری آنکھوں سے چلتی ہے
اور بانہوں اورسینے کی وادیوں میں پہنچ کر دن کے آگے ہتھیار ڈال دیتی ہے
تمھارے ہونٹوں کی گلیوں میں سورج کا خون بکھرا ہوا ہے
تمھاری ان دو آوارہ لٹوں نے رات کا گلا گھونٹ دیا ہے
تمھارے دوپٹے کے ہاتھ بادلوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں
میری آنکھوں نے تمھیں چوم چوم کر اپنا بیڑا غرق کر لیا ہے
تم ان پرندوں کو کب تک اڑنے سے روکو گے
میرے ہاتھوں کی کھلی فضا ان کی منتظر ہے

۶۲

تمھارے بائیں کان سے چمٹا ہوا ستارہ کئی بار میرے دل کی سرحدوں کی خلاف ورزی کر چکا

۲۲

مچھروں کے منھ کو خون لگ گیا ہے
اب یہ پنکھا ہوا کے ہاتھ نہیں لگے گا
ان سفید چادروں کو کون روز نہلائے گا
آسمان ستاروں کی چور بازاری سے اپنا پیٹ پال رہا ہے
سورج نے ایک عرصے سے پھولوں کو جیب خرچ نہیں دیا
زمین اپنی مفلوج ٹانگوں کی وجہ سے کسی تقریب میں شرکت نہیں کر سکتی
اتنی خوبصورت آنکھوں کے ساتھ تمھیں کہیں کی بھی شہریت مل سکتی ہے
محبت نے مجھے تمھارے ارد گرد گھومنے والے کیڑوں تک سے تعلقات بنانے پر مجبور کر دیا ہے
میں تمھارے کسی بھی جگہ کے بالوں میں شامل ہونا پسند کروں گا
تمھاری پلکوں کی ہلکی سی لرزش اس نظم کی قسمت بدل سکتی ہے
بادلوں کو در در کی ٹھوکریں کھانے سے کوئی نہیں بچا سکتا
چاند نے سمندر کو رات کے کپڑے اتارتے ہوئے دیکھ لیا تھا
خود لذّتی اس دُوری کا علاج نہیں صرف ایک کوشش ہے
راستے میں پڑے گوبر کی چھت سے ہاتھ ہلاتی گندم کی بالیاں تمھیں نظر نہیں آئیں گی
ٹوٹی ہوئی شاخوں نے اپنے نئے شادی شدہ بچوں کے لیے گھر خالی کیا ہے
تمھاری ٹانگوں میں چھپا ہوا برمودا ٹرائنگل مجھے اپنی طرف کھینچ رہا ہے
تصوّرات میں کئی بار میں نے تمھارے جسم کی ڈکشنری سے استفادہ کیا ہے
یہاں یادوں کے کھوٹے سکّے بھی کام آ جاتے ہیں

۳۰

محبت مجھے نوچ نوچ کر کھا رہی ہے

۵۱

تمھارے ہاتھ کے شمال مشرقی حصّے میں میرے نام کی تختی لگی ہوئی ہے
تم نے میرے ذہن کے ایک ایک چپّے میں بارودی سرنگیں بچھا دی ہیں
میں نے تمھاری آنکھوں کی سرحدی چوکی پر قبضہ کر کے دل کی طرف پیش قدمی شروع کر
ہے
اب ہم ایک دوسرے کے ہاتھوں سے نہیں بچ سکتے

Scanned with CamScanner

محبت تمہاری آنکھوں کے بہتے ہوے پانی میں اپنے دونوں پَر بھیگوتی ہے
اور آ کر میرے دل کی شاخ پر بیٹھ جاتی ہے
محبت تمہارے سینے کی دونوں چوٹیوں کو سر کرتی ہے
اور آ کر مجھے اپنے ٹوٹے ہوے ہاتھ پاؤں دکھاتی ہے
محبت تمہاری رانوں کی بھول بھلیّوں میں کہیں گم ہو جاتی ہے

احمد فواد

سوات میں پیدا ہوے۔ چند سال پیشتر کراچی یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم اے کیا۔ آج کل چترال کے ایک کالج میں انگریزی کے استاد ہیں۔ نظموں کا مجموعہ زیرِ ترتیب ہے۔

محمد خالد اختر

ہندوستان کی سرسری تاریخ ۔ ۱

ملک ہندوستان کی آخری یادگار تاریخ

جس میں دو راکھشسوں، تین شیروں (اصلی)، چوبیس ہونے والی باتوں اور چار سو نہ ہونے والی باتوں، سب جنگوں، قحطوں، وباؤں، مستقل جنگ آزمائیوں، پانچ اعظم بادشاہوں اور بہت سے عام تام بادشاہوں (اور ملکاؤں) کا ذکر ہے۔ اور جس میں (مجبوراً) چند تاریخیں بھی دے دی گئی ہیں۔

از

خالد اختر (بی ایس سی انجنیئرنگ)

و

جناب ایم خالد (بی اے، پنجاب یونیورسٹی)

انتساب

یہ کتاب بصد عزت و احترام عالی جناب ظریف الملک شفیق الرحمن کے نام معنون کی جاتی ہے، جن کے حسبِ فرمان اور زیرِ ہدایت اس تاریخ کی ترتیب و تالیف عمل میں لائی گئی۔

گر قبول اُفتد زہے عزّ و شرف
و گر قبول نہ اُفتد زہے عزّ و شرف

سرسری مقدّمہ

ہمارا، یعنی کم مایہ مصنّفین کا، اس تاریخ کا مقدّمہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا، مگر یہ دیکھتے ہوے کہ زمانے کے دستور کے مطابق اکثر کتابوں کے مقدّمے لازمی ہوتے ہیں، ہم بھی مقدمہ کر رہے ہیں۔ (ہمارے بہت سے موقّر احباب، مثلاً آئی بکرا، ایف اے (فیل)، مس عفیفہ ناز، پی ایچ ڈی، وغیرہ نے ازراہِ محبت اس کا مقدّمہ کرنے کی پیش کش کی تھی، مگر ہم نے ان کو باز رکھا اور صاف صاف کہہ دیا کہ ہم خود کریں گے)۔

rekhta

Scanned with CamScanner

یہ ہندوستان کی پہلی آخری تاریخ ہے۔ اس سے پہلے اس ملک کی کئی مفصّل اور ضخیم تاریخیں، بہت سے مشرقی اور مغربی مورّخوں کی لکھی ہوئی، موجود ہیں، مگر یہ آخری تاریخ ہے جس کی ضرورت کو ایک عرصے سے محسوس کیا جا رہا تھا۔ اس کے بعد مزید تاریخیں غیرضروری ہو گئی ہیں، اور اگر پھر بھی کوئی اصحاب (یا لوگ) اس میدان میں اپنے جوہر دکھائیں، تو وہ اصحاب (یا لوگ) اس کے خود جوابدہ ہوں گے۔

یہ مستند آخری تاریخ ہے جس کے بعد تاریخ کے طالبِ علم کو دوسری اگلی پچھلی تاریخوں کے پڑھنے کی حاجت نہیں رہے گی۔ سب ضروری معلومات، جو ہمیں اسکول کے دنوں سے یاد رہ گئی تھیں، اس میں جمع کر دی گئی ہیں اور اسے ہر طرح سے مکمّل اور مفید بنانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا گیا۔ اس تاریخ کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں، حتّی الامکان، واقعات کی تاریخیں دینے سے اجتناب برتا گیا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ تاریخوں کی بھرمار سے اکثر طالب علموں کا ذہن سٹپٹا جاتا ہے اور قوت ہاضمہ (طالب علموں کی) جواب دے جاتی ہے۔ ویسے بھی ہماری رائے میں، اور غالباً آئن سٹائن کی رائے میں بھی، وقت ایک اکائی ہے، اور ٹھہرا ہوا ہے، آگے پیچھے نہیں جاتا، ہم خود ہی وقت میں آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں، جس میں وقت کا کوئی قصور نہیں۔ یہ تھیوری اگر کسی کی سمجھ میں نہیں آئی تو پوری طرح ہماری سمجھ میں بھی نہیں آئی۔

ایک دوسری (امتیازی) خصوصیت اس تاریخ کی یہ ہے کہ اس کی تالیف میں اپنے، اور اپنے احباب (اے بکر، ایف اے فیل اور مس عفیفہ ناز وغیرہ)، کے حافظوں سے مدد لی گئی ہے، اور اسکول میں پڑھی ہوئی تاریخوں، یا دوسری تاریخوں کو خواہ مخواہ الٹا پلٹا نہیں گیا، اس لیے یہ آخری ہونے کے ساتھ اوریجنل ہے، یعنی بالکل اصلی۔

تیسری (امتیازی) خصوصیت یہ ہے کہ(... ابھی ابھی ہمارے ذہن میں تھی، اور اب سوجھ نہیں رہی... ہاں یاد آ گئی)، وہ یہ کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ آخر تاریخ کیوں پڑھی جائے۔ تاریخ کا جاننا (ہماری رائے میں) اس لیے لازمی اور ضروری ہے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو سکے کہ ان کی تاریخ کیا ہے اور وہ اپنی موجودہ حالت کو کیوں کر پہنچے۔

آخر میں ہم، یعنی مصنّفین، اپنے ان سب دوستوں اور بہی خواہوں (مسٹر آئی بکرا اور عفیفہ ناز سمیت) کا شکریہ ادا کرتے ہیں، جنھوں نے اس کتاب کو مفید تر بنانے کے لیے ہمیں طرح طرح کے بیش قیمت مشورے دیے۔ ہم نے وہ مشورے قبول نہیں کیے۔ اگر ہم ایسا کرتے تو یہ کتاب ساری کی ساری مشوروں کی کتاب بن جاتی اور اس آخری تاریخ کو دوبارہ لکھنا پڑتا۔

اہم گزارش:

ہم نے اس تاریخ میں سب راجوں، مہاراجوں، بادشاہوں اور نامور اصحاب (بشمول حیوانات)، جن سے ہندوستان کا نام روشن ہے، انصاف کرنے کی کوشش کی ہے، اور اپنی طرف سے کوئی بات نہیں لکھی۔ اگر ان میں سے بعض ہمارے خلاف عدالت میں ازالۂ حیثیت عرفی کا دعوے دائر کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں (ان باتوں سے اتفاق نہ کرتے ہوئے جو ہم نے ان کے بارے میں کہی ہیں) تو اس

سے کوئی ان کو فائدہ نہیں ہو گا، کیوں کہ وہ سب کے سب اب وفات پا چکے ہیں / چکی ہیں۔

م - خ - ا

م - خ

طبع دوم کا مقدّمہ

کتاب کا پہلا ایڈیشن، اصل مسوّدے کی شکل میں، مختلف ناشر حضرات کی خدمت میں پیش کیا گیا (مصنّفین خود بہ نفسِ نفیس یہ ایڈیشن لے کر گئے)، مگر ان سب نے اسے چھاپنے سے معذوری ظاہر کی (نہایت خوش اخلاقی سے)، حالانکہ ہم نے انھیں یقین دلایا کہ ان کے لیے اس آخری تاریخ کو چھاپنے کا یہ آخری موقع ہے اور یہ بھی واضح کیا کہ یہ درسی کتاب ہے۔ سخت بددلی کی حالت میں ہم نے اپنے مسوّدے کا ذکر اپنے دوست اجمل کمال صاحب سے کیا، جو "آج" رسالہ نکالتے ہیں اور دوستوں کی کتابیں چھاپتے ہیں۔ انھوں نے سرسری تاریخ کو اپنے موقّر مجلّے "آج" میں قسط وار شائع کرنے کی حامی بھر لی، جو پوری کی پوری چھپ جانے پر کتاب کا دوسرا ایڈیشن کہلائے گی۔ ہمیں مسرّت ہے کہ انھوں نے یہ فیصلہ دوستی کی بنا پر نہیں بلکہ کتاب کی افادیت اور اہمیت کو دیکھتے ہوئے کیا ہے۔ ہم ان کے شکرگزار ہیں، اور ان کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ اس کی اشاعت کے بعد وہ پشیمانی سے بچے رہیں۔

ہم نے پہلے ایڈیشن، یعنی اصلی مسوّدے، کی چھ یا سات عکسی نقول نکلوا کر مختلف اخباروں کے دوست ایڈیٹروں اور چند اپنے قدردانوں کو بھجوائی تھیں۔ الحمدللہ، بالعموم کتاب کو پسند کیا گیا جس سے ہماری حوصلہ افزائی ہوئی۔ ایک دو اخباروں نے تبصرے کیے اور قدردانوں نے ہمیں خیرسگالی کے پیغامات بھیجے۔ ان آراء میں سے چند اقتباسات درج ذیل ہیں:

"یہ ہندوستان کی سرسری تاریخ ہے۔" (توپ و تفنگ)

"مصنّفین کی آخری کوشش قابلِ داد ہے۔ وہ اپنا وقت کسی بہتر کام میں صرف کر سکتے تھے۔" (ماہنامہ آلو)

"آپ کی آخری تاریخ بہت پسند آئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کا انجام بخیر کرے۔ وادیٔ سندھ کی تہذیب میں آپ پالتو جانوروں کا ذکر کرتے ہوئے بکروں کو بھول گئے۔ کیا آپ کی بکروں سے کوئی دشمنی ہے؟" (مسٹر آئی بکرا کے خط سے)

"ابھی نہیں پڑھ سکی - اپنا تازہ ترین فوٹو بھجوائیے۔" (عفیفہ ناز کے خط سے)

یہ آخری مقدّمہ ہے۔ طبع سوم پر مقدّمہ نہیں ہو گا۔

م - خ - ا، بی ایس سی

م - خ ، بی اے

Scanned with CamScanner

باب اوّل

وادیِ سندھ کی تہذیب کا عروج و زوال

اسے ہڑپّا، موھن جو دڑو کلچر بھی کہتے ہیں۔ یہ تہذیب آج سے چار پانچ ہزار سال قبل اپنے شباب پر تھی۔ اس تہذیب میں سانس لینے والے خوش نصیب لوگ اب سب کے سب مر چکے ہیں۔ وہ لوگ جو آج کل ہڑپّا، موھن جو دڑو میں، یا ان کے آس پاس رھتے ہیں، موجودہ کلچر سے تعلّق رکھتے ہیں، جن کو چار پانچ ہزار سال بعد دریافت کیا جائے گا۔ اس تہذیب میں خاص بات یہ ھے کہ یہ بہت قدیم اور یادگار تہذیب تھی، یعنی اس زمانے کی جب مصر میں فرعون کی حکومت تھی، اور فلسطین میں حضرت موسےٰ کی اُمّت بنی اسرائیل پر من و سلوا اتر رہا تھا۔ ھم ہڑپّی کلچر پر فخر کر سکتے ہیں، جو اس وقت کی دنیا کی اوّل درجے کی ترقی یافتہ قوم تھے (آئی بکرا، ایف ۔ اے فیل، کی بھی یہی رائے ھے)، حالانکہ اب ھمارا نام تیسرے درجے کی ترقی پذیر قوموں میں سرِفہرست آتا ھے۔ ذاتی تحقیق سے ھم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اپنی زبان میں دو سو چالیس کے لگ بھگ حروفِ تہجّی ھونے کے باوجود ان کی شرح خواندگی پچاس فی صد تھی، اور جی این پی (گراس نیشنل پروڈکٹ) بارہ فی صد۔

موھن جو دڑو، ہڑپّا اور اس تہذیب کے دوسرے شہروں کے کھنڈرات کو دیکھ کر پتا چلتا ھے کہ کسی ریاضی دان معمار نے بڑے قرینے سے ان کا خاکا ڈالا ھو گا۔ مغرب کی سمت اینٹوں کے وسیع و عریض چبوترے پر گڑھی اور راج محل، نیچے سینتیس فٹ چوڑی سڑکوں اور کوچوں کے دونوں طرف پختہ اینٹوں کے دو منزلہ مکان جن کی کھڑکیاں سڑک کے رخ نہیں ہیں، قربان گاہ، پختہ حوض، اناج گھر۔ ہر گھر میں پانی کے نکاس کی موریاں ہیں جو اسے ایک ڈھکی پختہ بدرو میں لے جاتی ہیں۔ (ھم، اس کتاب کے ناچیز مصنّفین، نے حکومت کو تجویز پیش کی ھے کہ وہ لاھور، کراچی اور دوسرے شہروں کے میئر حضرات کے وفد کو موھن جو دڑو کے ڈرینیج کے نظام کو دیکھنے کے لیے بھیجے تاکہ وہ اپنے شہروں میں اسے رائج کر سکیں۔ حکومت کی جانب سے ابھی کوئی جواب نہیں آیا۔)

ان شہروں کی کھدائی میں چند انسانی مورتیاں بھی برآمد ھوئی ہیں، اور بہت سی نرم پتھر کی مہریں جن پر کمانی دار سانڈوں، گینڈوں اور شیروں کی تصویریں کمال فنکاری سے کندہ کی گئی ہیں، اور سنگِ خارا کا ترشا ھوا ایک چھوٹا سا بت ایک کہن سال دیوی کے پروھت یا پجاری کا ملا ھے، مونچھیں منڈی ھوئی، منقش داڑھی، گھٹا ھوا سر، ایک کندھا ایک ٹھپّا لگی قبا سے ڈھنپا ھوا، اپنے موٹے ھونٹوں کے ساتھ وہ منگول ساخت کا لگتا ھے، اور ممکن ھے منگول ہی ھو جو بھٹک کر موھن جو دڑو میں آ نکلا ھو۔ سب سے دلآویز اور آرٹسٹک مورتی کانسی میں ڈھالی ھوئی ایک رقّاصہ لڑکی کی ھے، ماسوا ایک کنٹھ مالا اور چوڑیوں سے ڈھنپے ھوے ایک بازو کے بالکل برھنہ، دوسرا بازو ایک کولھے پر رکھے اور ایک ٹانگ کو عشوہ طرازی سے خم دیے یہ بتِ پیشہ چھریرے بدن کی لڑکی اس شوخ ادائی سے کھڑی ھے جیسے اسے کسی کی پروا نہ ھو۔ اس مجسمے سے معلوم ھوتا ھے کہ وادیِ سندھ کے لوگوں کو شرم وحیا سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ عورتیں یقیناً نہ دوپٹے اوڑھتی تھیں نہ برقعے پہنتی تھیں۔ آزادانہ اور بیباکانہ ایک انگیا اور ایک

لہنگا پھڑکاتی ہڑپّا اور موھن جو دڑو کے بازاروں اور گلی کوچوں میں گھومتی پھرتی تھیں۔ ھمیں افسوس سے کہنا پڑتا ھے کہ جنسی بےراہ روی عام تھی۔

ان کو پالتو جانور رکھنے کا شوق تھا۔ ویسے بھی کتّے بلّیوں اور چند دوسرے جانوروں کو خواہ مخواہ پالتو بننے کی لت ھوتی ھے، جس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ بیلوں سے یہ ہل جوتتے اور سواری کا کام لیتے تھے۔ گدھوں سے اور گھوڑوں سے ابھی ان کی واقفیت نہیں ھوئی تھی، اور وہ غالباً ان کے خلاف تھے، ورنہ ان کو مصر و میسوپوٹیمیا سے درآمد کر لیتے جن ملکوں کے ساتھ ان کے تجارتی تعلقات تھے ۔ برسبیلِ تذکرہ ھم خود گھوڑوں کے سخت خلاف ہیں، گو گدھوں کے لیے ھمارے دل میں نرم گوشہ ھے۔ مصر و شام کو بھی وہ بڑی یا بحری راستے سے کپاس، ہاتھی دانت (بغیر ہاتھی کے)، لنگور، مور وغیرہ برآمد کرتے تھے۔ (یہ معلوم نہیں کہ فرعون اور اس کے امرا لنگوروں کو کیا کرتے تھے۔)

لٹریچر اور آرٹ میں اس ہڑپّی قوم نے کئی کارنامے سر انجام دیے، مگر چونکہ ھم ان کی زبان نہیں جانتے وہ ھمارے کسی کام کے نہیں۔ یوں بھی اُس زمانے میں کتابیں چھاپنے کا رواج نہ تھا۔

اِن دنوں ھمارے محقّقین کے درمیان یہ بحث چھڑی ھوئی ھے کہ وادیِ سندھ کی تہذیب میں مادری نظام رائج تھا یا پدری۔ ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کی رائے میں یہ تہذیب مادری تھی۔ ایک اور محقّق رشید ملک کا دعوا ھے کہ یہ تہذیب سراسر پدری تھی۔ ھم بعض وجوہات کی بنا پر، جو ھمیں خود بھی اچھی طرح معلوم نہیں، دونوں سے اتّفاق نہیں کرتے۔ ھماری رائے میں یہ تہذیب مادری پدری تھی۔ یہ سوال بھی اٹھا ھے کہ یہ لوگ جنھوں نے اتنی عظیم الشّان تہذیب کی بِنا ڈالی کون لوگ تھے، کس نسل کے تھے، کہاں سے آئے تھے۔ پہلے کئی محقّقین نے تھیوریاں پیش کیں کہ وہ وسطی ایشیا یا آسٹریلیا یا جنوبی اوقیانوس کے جزیرے ایسٹر آئی لینڈ سے ھجرت کر کےآئے تھے۔ اب سب اس بات پر متّفق ھو چکے ہیں کہ وہ کہیں سے آئے گئے نہیں تھے، یہیں کے اصلی باشندے تھے اور شروع سے یہیں رھتے بستے تھے۔

ابھی یہ عُقدہ حل نہیں ھوا کہ یہ تہذیب آناً فاناً حرفِ غلط کی طرح صفحۂ ھستی سے کیسے مٹ گئی۔ اتنا پتا چلا ھے کہ یہ تہذیب ایک مدّت سے زوال پذیر اور بوڑھی ھو چکی تھی، اور اس کے شہروں میں اِدھر اُدھر کے مہاجروں نے آ کر شہری نظام کو درھم برھم کر دیا تھا، چوکوں اور سڑکوں کے بیچ جھونپڑے کھڑے کر لیے تھے، پھر شمال مغرب سے ھُن لوگ اپنے جنگی رتھوں میں ڈنڈی دَل کی طرح آئے اور ان پر پل پڑے۔ انھوں نے ہڑپّا سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، ہزاروں لوگوں کو تلوار کے گھاٹ اتارا اور ہر ایک چیز کو تہس نہس کر دیا۔ یہ کرنے کے بعد انھوں نے خود اپنے آپ کو بھی تہس نہس کر ڈالا اور آندھی کی طرح جیسے آئے تھے ویسے غائب ھو گئے۔

اس آفت کے بعد وادیِ سندھ کے شہروں میں اُلّو بولنے لگے، (پہلے وہ شہروں کے باہر ویران جگھوں میں بولتے تھے)۔ وہاں کے پالتو جانور، کتے، بلّیاں، گائے بیل، طوطے وغیرہ، (جن کی طرف ھُن لوگوں نے خاص توجّہ نہیں دی تھی، ماسوا اس کے کہ چند ایک کو انھوں نے کھایا تھا) کچھ مدّت تک تو اپنے مالکوں کے لوٹ آنے کا انتظار کرتے رھے، پھر اپنے اپنے منہ اٹھا کر جس سمت دل چاہا چل دیے یا مر گئے۔ شہروں کے مکانوں، حویلیوں اور راج محلوں کو بھیڑیوں، شیروں

Scanned with CamScanner

اور اڑدھوں نے اپنا مسکن بنا لیا (اُلو زیادہ تر درختوں یا مکانوں کی مُنڈیوں میں رہائش پذیر تھے اور وہاں سے مسلسل بولتے رہتے تھے۔)

وادیِ سندھ کی تہذیب کے عبرت ناک انجام کے چند سو سال بعد تک ہندوستان میں سنّاٹا سا چھایا رہا، اور کچھ نہیں ہوا۔ اس لیے ان چند سو سالوں کی کوئی تاریخ نہیں۔

(بعض مقامی محقّقین مثلاً موہن رام سرمے دانی اور سیّد مومن علی موہنی کے مطابق موہن جو دڑو اور وادیِ سندھ کی تہذیب کو موہن نے شروع کیا تھا۔ یہ غلط ہے۔ اس زمانے میں موہن، سوہن وغیرہ نہیں ہوتے تھے، وہ بعد میں آئے۔

جماعتِ اسلامی کے ایک لیڈر مولانا فلاح الدّین نے حال ہی میں اپنے ایک بیان میں وادیِ سندھ کی تہذیب پر فحاشی اور بےحیائی کا الزام لگاتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ اس تہذیب کو "بین" کیا جائے، اور درسی کتب دوبارہ لکھی جائیں جن میں اس تہذیب کا ذکر نہ ہو۔ انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ رقّاصہ کی برہنہ مورتی کو، جسے دیکھ کر جذبات برانگیختہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے، میوزیم میں رکھنے کی بجائے، بحیرۂ عرب میں پھینک دیا جائے۔ جماعت اس بارے میں نیشنل اسمبلی میں ایک بل پیش کرنے پر بھی غور کر رہی ہے۔

ہماری رائے میں چونکہ یہ تہذیب اب واقع ہو چکی ہے، اس کو جوں کا توں رہنے دینا ہی مناسب ہے۔

باب دوم

ایرین یا آریاؤں کا ہندوستان کے ملک میں ورودِ مسعود

ہُن لوگوں کے وادیِ سندھ پر حملے کے تین سو سال بعد ایرین یا آریائی لوگوں نے ہندوستان کا رخ کیا۔ بعض مورّخین کا خیال ہے کہ وہ جرمنی سے بھاگ کر نکلے تھے، اور بعض کہتے ہیں کہ وہ آریا مہر کے ملک ایران کے ایرانی الاصل تھے جو اپنی قومیت تبدیل کرانا چاہتے تھے۔ ہُن لوگوں کے برعکس وہ ہندوستان پر حملہ کرنے کی غرض سے نہیں آئے تھے بلکہ اسے آباد کرنے کی خاطر، کیونکہ تب ہندوستان، ماسوا اپنے اصلی باشندوں کے، غیرآباد تھا۔ اس زمانے میں وہ لمبے تڑنگے، سفید فام، خوش شکل ہوتے تھے۔ (آج کل کے آریائی مختلف ہیں)۔ وہ اپنے خیمے، بال بچّے، ڈھور ڈنگر، دیوی دیوتے، سواستیکا کے پھریرے ساتھ لے کر آئے۔ پہلےپہل اصلی باشندوں نے ان کی کوئی مزاحمت نہ کی؛ انھوں نے سمجھا کہ آریائی ملک میں بغرضِ سیاحت و تفریح آ رہے ہیں، اور گھوم پھر کر اپنے گھروں کو لوٹ جائیں گے۔ پھر جب آریاؤں نے پاؤں پسارنا، بستیاں بسانا اور زمینوں پر قبضہ جمانا شروع کیا، تو اصل باشندوں کا ماتھا ٹھنکا۔ اصل باشندوں نے، جو قدرے سیاہ رنگت اور چھوٹے قد کے لوگ تھے، پہلےپہل آریاؤں سے بہتیرا کہا سنا کہ وہ اپنے اصل وطن کو واپس چلے جائیں جہاں سے وہ آئے تھے، اور اگر ان کو اپنے مویشیوں کے لیے چارے کی ضرورت ہے تو اسے ان کے اصل وطن کی زمین پر بھی اگایا جا سکتا ہے، مگر آریاؤں نے یہ بات سنی اَن سنی کر دی۔ اب انھوں نے الٹا بےچارے اصل باشندوں کو، جو دراوڑی، بھیل، گونڈ، تامل وغیرہ نسلوں

سے تھے، پیچھے دھکیلنے، اور ان کی زمینوں پر قدم جمانے کا وطیرہ اختیار کیا، جس میں انھیں اپنے بہتر کلچر کی وجہ سے خاصی کامیابی ہوئی۔ یہ دراوڑی، بھیل، گونڈ، تامل وغیرہ ہٹتے ہٹتے جنوبی ہندوستان میں جا پہنچے، جہاں وہ اب تک مقیم ہیں۔ تامل، آدم کا پل عبور کر کے لنکا میں جا بسے، اور تامل ٹائیگر بن گئے (حالانکہ وہ اصلی ٹائیگر نہیں ہیں)، اور اب مسٹر پریما داسا کے لیے دردِسر بنے ہوئے ہیں۔ ویسے یہ اصلی باشندے اب کافی مہذّب ہو گئے ہیں، اور ایک دوسرے کو نہیں کھاتے (پہلے کھاتے تھے)۔ اصل باشندوں نے جنوب میں پہنچ کر آریاؤں کے خلاف فلسطینیوں کی طرح "انتفادہ" کی تحریک چلائی، مگر چونکہ آریائی اب تقریباً سارے ملکِ ہندوستان پر قبضہ کر کے اصل باشندے بن چکے تھے، اس لیے اس تنازعے کا فیصلہ نہیں ہو سکا۔

ایرین آئے تھے یا نہیں آئے تھے؟

بعض جدید محقّقین کی رائے ہے کہ ایرین یا آریائی لوگ کوئی قوم نہیں تھے، نہ انھوں نے اپنا گھر بار چھوڑا (اگر ان کا کوئی گھر بار تھا)، نہ ہندوستان میں موج در موج آئے۔ دوسرے کہتے ہیں کہ ایرین یا آریائی تھے، اور ان کا آنا ثابت ہے۔ حال ہی میں ہمارے دو بڑے محقّقین اور ماہرین میں اس مسئلے پر شدّت کی چَخ چَخ چلی ہوئی ہے، اور دونوں کے حواری خم ٹھونک کر میدان میں آن اترے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کو اصرار ہے کہ ایرین یا آریائی اپنی پدری تہذیب کے ساتھ ہندوستان میں آئے تھے۔ ماہرِ موسیقی رشید ملک کہتے ہیں کہ آریائی تھے ہی نہیں جو آئے، اور ڈاکٹر وزیر آغا جَھک مارتے ہیں۔ ہماری رائے میں (اور آئی بکرا، ایف اے فیل کی رائے میں) آریائی ضرور ہندوستان میں "موج در موج" آئے تھے، کیونکہ اگر وہ نہ آئے ہوتے تو اصل باشندے، دراوڑ، بھیل، گونڈ، تامل وغیرہ وغیرہ، صرف جنوبی ہندوستان میں نہ رہ رہے ہوتے۔ ویسے بھی آریاؤں کا "موج در موج" آنا لازمی تھا، کیونکہ ان کے نہ آنے کی صورت میں، (موج در موج)، ہندوستان کی تاریخ کی ابتدا نہ ہوتی، اور نہ ہمارے اس آخری تاریخ پیش کرنے کی نوبت آتی۔

ایرین یا آریاؤں کا کلچر

یہ غلط ہے کہ آریائی ایسے ویسے لوگ تھے، یا جنگلی تھے۔ ان کا کلچر تھا، اور بالخصوص ایگری کلچر میں وہ اُس دور کی دوسری قوموں سے بہت آگے تھے۔ ہندوستان میں پہنچ کر انھوں نے ہی پہلےپہل ہَل کے آگے دو بَیل جوت کر کھیتی باڑی کی بِنا ڈالی، اور جَو، گندم، سرسوں وغیرہ کی فصلیں اگائیں۔ (اصل باشندوں کا کلچر تھا نہ ایگری کلچر۔ وہ پھل پھول کھاتے تھے یا پھر ایک دوسرے کو)۔ انھوں نے ایگری کلچر کے علاوہ دوسرے پیشوں میں بھی مہارت پیدا کی، اور نامی گرامی جُلاہے، زَرگر، لوہار، نعل بند، بڑھئی پیدا کیے۔ ان کا حجامت کرنا بھی ثابت ہے، جو حجّاموں کے بغیر ممکن نہیں۔

ایرین یا آریاؤں کا مذہب

ہر کسی کی طرح آریاؤں کا بھی مذہب تھا۔ وہ سورج، چاند، آسمان، ہوا، بَڑ کے درخت،

Scanned with CamScanner

شیش ناگ (یا عام سانپ)، گھوڑے، ہاتھی، شیر اور ہر وہ بڑی چیز کی پرستش کرتے تھے (ہم ان کی گھوڑوں کی پرستش کرنے کی منطق کو نہیں سمجھ سکے)۔ وہ بھجنوں اور چڑھاووں سے ان قوتوں کو خوش اور رام کرنے کی کوشش کرتے۔ بعد میں وہ ایک خدا کو پوجنے لگے، اور پکّے موحّد ہو گئے۔

ایرین یا آریاؤں کے مشاغل، کھیل کود وغیرہ

وہ کرکٹ، ہاکی، فٹ بال اور ٹینس جیسے کھیلوں کے حق میں نہیں تھے۔ وہ رتھوں کی دوڑ کے مقابلوں، شکار، چوسر، گنجفہ سے دل بہلاتے تھے۔ تہواروں کے موقع پر بربط، بانسری اور ڈھول کی تال پر ناچتے گاتے اور غل غپاڑا کرتے۔ جوشے میں اکثر اپنا گھربار، ڈھور ڈنگر، بیوی بچّے ہار جاتے، اور پھر تن پر ایک لنگوٹا پہنے کسی قریبی جنگل کا رُخ کرتے۔

باب سوم

رام چندر ہنومان اینڈ کمپنی

رام چندر (یا راما چندرا) وشنو کے آٹھویں یا نویں اوتار تھے (ہم تفصیلات میں نہیں جائیں گے، کیونکہ یہ سرسری تاریخ ہے) اور خالص آریائی، گو اصل باشندے ان کو اپنی قوم کا فرد بتاتے ہیں۔ اس سے پہلے (یعنی اوتار بننے سے پہلے) انھوں نے ایودھیا (یعنی اودھ) کے راجا دسرتھ کی بڑی مہارانی کے بطن سے جنم لیا۔ یہ راجا کثیر الازواج تھا، جو اچھی بات نہیں، اور جس کی وجہ سے رام چندر (راما چندرا) کو بَن باس کاٹنا، اور اپنی دھرم پتنی سیتا کو لانے کے لیے لنکا پر دھاوا بولنا پڑا۔ رام چندر کی سوتیلی ماں، جونیر مہارانی چاہتی تھی کہ رام چندر کی بجائے اس کا اپنا بیٹا بھرت راج پاٹھ سنبھالے (راجا دسرتھ بوڑھا ہو چکا تھا اور اسے حکومت میں دلچسپی نہ رہی تھی)۔ جونیر مہارانی کیکئی اَنواٹی کھٹواٹی لے کر پڑ گئی اور اپنے تریا چرتر سے اس نے راجا دسرتھ سے رام چندر کو چودہ سال کے لیے بن باس کرنے اور اپنے بیٹے بھرت کو راج سونپنے کا وچن لے لیا۔ آریائی لوگ اپنے وچن سے پھرنے کو مہا پاپ جانتے تھے۔ (ہم سمجھتے ہیں راجا دسرتھ بہت زن مرید تھا)۔ قصّہ کوتاہ، رام چندر اپنے سب سے چھوٹے سوتیلے بھائی لکشمن، اور اپنی دھرم پتنی سیتا کو ساتھ لیے بن باس کاٹنے چلے گئے۔ انھوں نے دریائے گوداوری کے کنارے ڈنڈک کے جنگل میں اپنا استھان بنایا، اور ہرن کے گوشت اور پھل پھوڑ پر گزر اوقات کرنے لگے۔ جب بن باس کے چودہ برس پورے ہونے کو آئے تو لنکا کا راجا راون آ نکلا، (گو یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ لنکا سے اتنے کوسوں دور یہاں کیا لینے آیا تھا)۔ اس کی نظر سیتاجی پر پڑی، جو اپنی کُٹیا میں اکیلی تھیں (راما چندرا اور لکشمن شکار پر گئے ہوئے تھے اور ایک سونے کے ہرن کا پیچھا کر رہے تھے جو اُس زمانے میں عام تھے)۔ سیتاجی شکل صورت کی اچھّی تھیں، اور راون انھیں اپنے چوڑے کندھے پر ڈال کر لنکا لے گیا۔ (یہ ایک قطعی غیراخلاقی حرکت تھی)۔ رام چندر اور لکشمن شکار سے لوٹے تو سیتاجی کو اپنی کُٹیا میں نہ پایا۔ ایک واقف کار بندر نے، جو پاس ہی ایک پیڑ پر رہتا تھا، انھیں بتایا کہ سیتاجی کو لنکا کا راجا راون لے گیا ہے۔ وہ روتے دھوتے ان

کی تلاش میں جنوب کو چل پڑے (بعض لوگ کہتے ہیں انھوں نے یہ سفر اُڑن کھٹولے میں کیا، جو قرینِ قیاس نہیں)۔ آخر مالابار کے راجا سرجیو نے، جو بندروں کا بادشاہ تھا، سیتاجی کی بازیافتگی کے لیے ان کی مدد کرنے کی ہامی بھر لی، اور جرنیل ہنومان کی سرکردگی میں بندروں کا ایک عظیم الشّان لشکر لنکا کو فتح کرنے کے لیے ان کے ساتھ کر دیا۔ رام چندر اور ہنومان کی کمان میں سرجیو کی فوج نے لنکا کا محاصرہ کر لیا جو مہینوں جاری رہا۔ اس ہولناک خونریزی میں حق کی، یعنی رام چندر کی، فتح ہوئی، اور راون اور اس کے سردار کام آئے۔ لنکا کو ڈھانے کے بعد رام چندر نے راون کے ایک بھائی وجی شان کو تخت پر بٹھایا، جس نے جنگ میں ان کی مدد کی تھی۔ اب سیتاجی کو لے کر رام چندر، لکشمن، ہنومان اینڈ کمپنی سیدھے ایودھیا لوٹے کیونکہ رام چندرجی کے بَن باس کی مدّت پوری ہو چکی تھی۔ جنرل ہنومان جی نے اپنے راجا سرجیو کو اپنا استعفا بھجوا دیا، اور رام چندر کی ایودھیا میں جرنیلی کی پیشکش قبول کر لی۔

راجا دسرتھ ابھی زندہ تھا، مگر بےحد پیرِ فرتوت ہو چکا تھا، اور رانی کیکئی کسی وَبا میں مر کھپ گئی تھی۔ راجا بھرت نے اپنی سعادت مندی کا ثبوت دیتے ہوئے راج پاٹھ فوراً رام چندرجی کے حوالے کیا، اور رام چندرجی بڑی مدّت تک ایودھیا کی سلطنت کے حکمران رہے۔ سیتاجی کے نصیب میں خوشی نہیں آئی۔ ایودھیا کے لوگ سمجھتے تھے کہ راون کے محل میں اتنا عرصہ رہنے سے ان کی عصمت داغدار ہو گئی ہے۔ وہ اپنے بےداغ ہونے کا ثبوت دینے کے لیے جلتی چِتا پر بیٹھیں، مگر اگنی نے انھیں جلانے سے انکار کر دیا۔ لوگ پھر بھی نہ پسیجے؛ خود رام چندر کے من میں بھی سیتاجی کی طرف سے گرہ آ گئی تھی۔ آخر رام چندرجی انھیں بن باس دینے پر مجبور ہو گئے، اور وہ جنگل میں گرو دیو والمیکی کے آشرم میں زندگی کے دن کاٹنے چلی گئیں۔ وہاں ان کے دو جڑواں بیٹے پیدا ہوئے، جو آشرم میں ہی پلے بڑھے اور جوان ہوئے۔ مگر رام چندرجی کے دل سے شک دور نہ ہوا، اور انھوں نے ایک عرصے تک انھیں اپنی اولاد ماننے سے انکار کیا۔ یہاں وی شانتا رام کی فلم "سیتا" ختم ہو جاتی ہے۔

ہاں، بندروں کا بادشاہ سری جیو دراصل دراوڑی، بھیل، گونڈ وغیرہ تھا، اور اصل بندر نہیں تھا۔ ہنومان بھی اصل بندر نہیں تھے، گو شکل شباہت، وضع قطع بندروں کی سی تھی۔ عادات بھی ویسی ہی تھیں۔

لازمی نوٹ؛ لاھور

رام چندر کے جڑواں بیٹوں میں سے جس کا نام لاھو تھا، لاھور شہر کی بنیاد رکھی، جو اب تک دریائے راوی کے کنارے موجود ہے۔ لاھو نے پیشے کے طور پر والمیکی کے آشرم میں آہن گری کا کام سیکھا تھا، اور کافی ماہر لوہار تھا۔ بعد میں بہت سے دوسرے لوہار اس شہر میں آن آباد ہوئے، اور لوہے کی بھٹیاں جگہ جگہ سلگنے لگیں۔

آج کل یہ شہر اپنے لوہے کے کارخانوں کے لیے مشہور ہے۔

Scanned with CamScanner

اس واقعے کے (یعنی رام چندرجی کے بن باس سے لوٹنے کے) سو ڈیڑھ سو برس بعد کوروؤں اور پانڈوؤں نے، کوروکھشیتر کے میدان کو چٹیل اور وسیع پا کر، وہاں ایک زبردست جنگ (آپس میں) کرنے کا قصد کیا، حالانکہ وہ کزن تھے۔ کورو پانچ بھائی تھے، جو اندھے راجا دھسترا کے بیٹے تھے۔ (دھسترا کے سَو بیٹے اور بھی تھے، لیکن ہمیں ان سے واسطہ نہیں)۔ پانڈو بھی پانچ بھائی تھے، دھسترا کے بھائی پانڈھو کی اولاد۔ اندھا ہونے کی وجہ سے دھسترا کو حکومت کرنے میں دقّت ہوئی، اور اس نے راج پاٹھ اپنے بھائی پانڈو یا پانڈھو کو سونپ دیا۔ پھر یہ پانڈو یا پانڈھو ایک دھرم کار کا اپاگت کرنے کے لیے دھسترا کو تخت پر چھوڑ کر اپنی دو بیویوں کے ساتھ ہمالیہ چلا گیا، اور سنیاس لے لیا۔ پانڈو یا پانڈھو کے پانچ بیٹوں کے نام یُدھشٹر، بھیم، ارجُن، نبولا اور ساہ دیو تھے۔ جب پانڈو یا پانڈھو مر گیا تو دھسترا نے یہ پانچوں بچے اپنے پاس ہستناپور میں بلا لیے، جہاں ان کی کورو بردارز کے ساتھ پرورش اور تعلیم و تدریس ہوئی۔ جب پانڈو یا پانڈھو کا بڑا بیٹا یُدھشٹر جوان ہوا تو اصولاً اس کو ولی عہد ہونا چاہیے تھا، مگر اس کے کزن دریودھن کو یہ بات پسند نہ آئی، اور اس نے پانڈو برادرز کے خلاف ساز باز کی۔ (دریو دھن اچھا آدمی نہیں تھا)۔ جان بچانے کی خاطر پانچوں پانڈو بھائی آخر ملک چھوڑ کر دیس بدیس قسمت آزمائی کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوے۔ پھر راجا پنکالاس کے دربار میں ارجن نے سوئمبر میں راج کماری دروپدی جیت لی، اور چونکہ پانچوں بھائیوں میں آپس میں بڑی محبت تھی، انھوں نے اسے اپنی سانجھی بیوی بنا لیا۔ (ہم اسے اچھا نہیں سمجھتے اور دوسروں کو ان کی تقلید کرنے کا مشورہ ہرگز نہیں دیتے)۔ یہیں ان کی ملاقات کرشن جی مہاراج سے ہوئی جو گجرات کاٹھیاواڑ کے راجا تھے اور سوئمبر میں حصّہ لینے آئے تھے۔ وہ راجے واجے تو بس یونہی تھے، ہاں اُپدیشک ضرور تھے۔ سوئمبر میں اپنی ناکامی پر، یا پانڈوؤں کو برے حال دیکھ کر، اُن کی مدھ بھری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ اپنی لچھّےدار باتوں سے لوگوں کے دل موہ لیتے تھے۔ پانڈوؤں کو ان کی باتیں بڑی اچھی لگیں، اور وہ ان کے گرویدہ ہو گئے۔ کچھ مدّت کے بعد اندھے دھسترا نے اپنے بھتیجوں کو ہستناپور واپس بلا لیا۔ اس نے راج پاٹھ تج کر سلطنت کو اپنے بیٹوں کوروؤں اور اپنے بھتیجوں پانڈوؤں میں برابر برابر بانٹ دیا۔ پانڈو برادرز نے دہلی کے نزدیک ایک نئی راج دھانی اندرپرست بنا لی اور ہنسی خوشی راج کرنے لگے۔

لیکن دھسترا کے بیٹے اپنے باپ کے اس فیصلے پر خوش نہیں تھے، اور بڑے بیٹے دریودھن نے (وہ بالکل اچھا آدمی نہیں تھا) پانڈوؤں کے بڑے بھائی یدھشٹر کو چوسر کے میچ کی دعوت دی۔ اپنے مکّار ماموں مسکونا کی چالبازی سے، جو قماربازی کے سب داؤ پیچ جانتا تھا، اس نے یدھشٹر سے اس کی ساری سلطنت جیت لی، بھائیوں اور مشترکہ بیوی دروپدی سمیت۔ (ہماری رائے میں یدھشٹر نے جوئے کی دعوت قبول کر کے سخت حماقت کی، اور پھر بھائیوں اور دروپدی کو داؤ پر لگانے کی بھلا کیا ضرورت تھی؟ سچ کہتے ہیں جواری آدمی آگا پیچھا نہیں دیکھتا)۔ آخر کوروؤں اور پانڈوؤں میں اس بات پر سمجھوتا ہو گیا کہ پانچوں بھائی اور دروپدی تیرہ سال کے لیے ملک بدر ہو جائیں گے، اور اس کے بعد واپسی پر ان کی سلطنت ان کو سونپ دی جائے گی۔

پانڈوؤں نے اپنی جلاوطنی کے تیرہؔ سال اپنے رفیق اور غمخوار کرشن جی مہاراج کی صحبت میں بسر کیے، مگر یہ دیکھ کر حیران ہوے کہ وہ راجے وغیرہ کچھ نہیں تھے، بلکہ گوالوں کے ایک گاؤں کے مُکھی یا نمبردار تھے۔ ان کو ڈھنک کی اپنی رتھ بھی میسّر نہ تھی۔ ان کے دل پذیر بھاشن سُن سُن کر ان کے کان پک گئے، مگر ان کو وشنو کا آوتار جانتے ہوے (جو اپنے کہنے کے مطابق وہ تھے)، وہ ان کے سامنے بول نہ سکے۔ کرشن جی مہاراج نے ان کی خاطر داری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی؛ وہ ان کو دودھ کے بھرے کٹورے پلاتے اور ہرن کا گوشت کھلاتے۔ اس خوراک سے یدھشٹر صاحب بہت موٹے اور کاہل ہو گئے۔ باقی بھائیوں کی صحت بہتر ہو گئی (وہ شکار وغیرہ کھیلتے تھے)، اور دروپدی کا رنگ روپ نکھر آیا۔ تیرہ برس ہو چکنے کے بعد انھوں نے دریودھن کو سندیسا بھیجا کہ بھائی جی، تیرہ برس پورے ہوے، ہماری سلطنت ہمیں واپس کرو۔ بدنیت دریودھن نے چپ سادھی اور کوئی جواب نہ دیا۔ اب پانڈو برادرز نے جنگ کی تیاری کی اور کرشن جی مہاراج نے، جو اچھے خاصے "ملی ٹرسٹ" اور دوسروں کے معاملات میں اپنی ٹانگ اڑانے کے شوقین تھے، ان کی ہمت بندھائی۔ پانڈوؤں کے ہندوستان کے راجوں مہاراجوں میں اپنے بہت سے دوست تھے، اور وہ ایک بڑا لشکر جمع کرنے کے قابل ہو گئے۔ اس اثنا میں دریودھن اور اس کے بھائیوں نے اپنی فوج تیار کر لی۔ ہندوستان کے سب بادشاہوں، بلکہ چینیوں، ایرانیوں اور افغانیوں نے بھی اس کارِخیر میں حصّہ لینے کی ٹھانی، اور ایک یا دوسرے فریق کا ساتھ دیا۔ کوروکھشیتر کے میدان میں دونوں لشکر ایک دوسرے کے آمنے سامنے صف آرا ہو گئے۔ ارجن کا دل اپنے کزنز کے ساتھ جنگ کرنے پر ملول تھا، اور وہ کچھ ڈانواں ڈول تھا، مگر کرشن جی مہاراج نے (مُکٹ اور زرہ بکتر پہنے) ارجن کی رتھ میں اپنی، یعنی پانڈوؤں کی، فوج کا چھ گھنٹے کا معائنہ کیا اور ان کی سلامی لی۔ اس دوران وہ ارجن کو متواتر اپنا بھاشن دیتے رہے، اس کا حوصلہ بڑھاتے رہے، اور ایک لحظے کے لیے چپ نہیں ہوے۔ بعد میں یہ بھاشن بھگوت گیتا کے نام سے مقبولِ خواص و عوام ہوا۔ معائنے کے فوراً بعد جنگ شروع کر دی گئی۔ گھمسان کا رَن پڑا، کُشتوں کے پُشتے لگ گئے (یا اس کے الٹ)، وغیرہ وغیرہ۔ یہ جنگ، جو اس زمانے کی جنگِ عظیم تھی، اٹھارہ دن تک جاری رہی۔ آخر میں صرف پانچ پانڈو بھائی اور کرشن جی مہا راج زندہ بچے (ویسے کرشن جی مہا راج معائنے کے بعد اپنے خیمے میں چلے گئے تھے، اور انھوں نے جنگ میں براہِ راست کوئی حصّہ نہیں لیا کہ کہیں کورو برا نہ مان جائیں۔ ان کے کوروؤں سے بھی تعلقات تھے)۔ چنانچہ پانڈوؤں کو فتح ہوئی۔ یدھشٹر تخت پر متمکّن ہوا، اور وہ اور اس کے بھائی مدت تک امن اور شانتی سے راج کرتے رہے۔ کرشن جی مہاراج کچھ عرصے اندرپرست میں رہ کر اپنے گاؤں لوٹ گئے (ارجن کی رتھ میں)، جہاں ان کی گوپیاں اِن کی راہ تک رہی تھیں۔

اس جنگ کے بعد، جس میں طرفین کے لاکھوں سورما کام آئے، ہندوستان میں بڑی مدت تک کوئی اور جنگ نہیں ہوئی (کیونکہ سورماؤں کی اور آلاتِ حرب و ضرب کی شدید قلّت ہو گئی تھی) اور ایسا امن و امان پھر ہندوستان میں کبھی نہیں ہوا۔

Scanned with CamScanner

ٹیسٹ پیپر ۔۱

کُل نمبر ۱۰۰

(مہا بھارت کے دو سو برس بعد تک)

ضروری نوٹ: سوال نمبر ۵ کو چھوڑ کر کوئی سے چھ سوالات کے جوابات پچاس روپے کے پوسٹل سرٹیفکیٹ یا بیئرر چیک کے ساتھ لکھ بھیجو۔ سوال نمبر ۵ کا جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ سب سوالات کے نمبر یکساں ہیں۔ کامیاب ہونے والے اصحاب کو ہماری دستخط شدہ ماسٹر آف ہسٹری (پہلا ٹیسٹ میچ) کی اعزازی سند ارسال کر دی جائے گی۔

۱ ۔ تمھاری رائے میں وادیٔ سندھ کی تہذیب وادیٔ سندھ کی بجائے کہیں اور کیوں قائم نہیں ہو سکی؟ بچوں اور لڑکوں کے علاوہ اس تہذیب کے سب لوگ (صرف مرد) ڈاڑھی رکھتے تھے اور (بالائے لب) مونچھ منڈواتے تھے؛ اس کی کوئی خاص وجہ؟

۲ ۔ ان کی ایک مُہر میں دو سینگوں والے بیل کے سر والے ایک آدمی کو چھڑی یا تلوار سے پچھلی ٹانگوں پر کھڑے دو شیروں کے ساتھ چھیڑ خانی یا جنگ کرتے دکھایا گیا ہے۔ کیا اس تہذیب کے لوگوں (صرف مردوں) کا نچلا دھڑ آدمی کا اور اوپر والا دھڑ سینگ دار بیل کا ہوتا تھا؟ نیز کیا اس زمانے کے شیر آدمیوں کی طرح اپنی پچھلی ٹانگوں پر چلتے پھرتے تھے؟ واضح جواب دو۔

۳ ۔ وادیٔ سندھ والوں کی جنسی زندگی کے بارے میں دل کھول کر برملا تین یا چار صفحات کا جواب مضمون لکھو ۔ شرمانے کی ضرورت نہیں۔

۴ ۔ وادیٔ سندھ کے لوگ گھوڑوں کے برتنے کے خلاف کیوں تھے، حالانکہ دوسرے حیوانات ان کو پسند تھے؟ تمھاری اپنی گھوڑوں کے متعلق کیا رائے ہے؟ کیا ان کو ہونا چاہیے؟

۵ ۔ موھن جو دڑو میں برھنہ رقاصہ کی جو کانسی کی مورتی دستیاب ہوئی ہے، اس کی انالومی پر بالتّفصیل اظہارِ خیال کرو۔

۶ ۔ رام چندرجی اگر راجا دسرتھ کی بجائے کسی اور راجا کے بیٹے ہوتے تو کیا اتنی جلدی بن باس ہونے پر تیار ہو جاتے؟ نیز کیا راجا دسرتھ زن مرید تھا؟ اور کیا سب مردوں (شادی شدہ) کا یہی حال ہوتا ہے؟

۷ ۔ کیا راون حقیقی راکھشس تھا؟ لنکا کا راجا ہونے کی وجہ سے اس کی بےشمار اپنی بیویاں تھیں، اسے دوسروں کی بیویوں پر ہاتھ صاف کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ راون کی اخلاقی حالت کا تجزیہ کرو۔

۸ ۔ جرنیل ہنومان جی (تمھاری رائے میں) واقعی بندر تھے، یا ہندوستان کے اصلی باشندے ہونے کی وجہ سے بندر لگتے تھے؟ انڈین فلم رامائن کو غور سے وی سی آر پر دیکھ کر لنکا میں ان کے کارناموں پر روشنی ڈالو۔

۹۔ کیا آریائی آئے تھے، یا نہیں آئے تھے؟ دونوں جدید پاکستانی محققوں ڈاکٹر وزیر آغا اور رشید ملک کے ملفوظات پڑھ کر دونوں طرف سے دلائل دو (زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں، مختصر لکھو)۔

۱۰۔ کورو اور پانڈو فرسٹ کزن ہو کر ایک دوسرے کی جان کے درپے کیوں تھے؟ ان کے لڑانے اور مہا بھارت کا یُدھ کرانے میں بھگوان کرشن جی مہاراج کا کتنا ہاتھ تھا؟ تم راجا ہوتے تو کس کی حمایت کرتے؟ بےشک سنسکرت میں جواب دو۔

۱۱۔ پانچوں پانڈو بھائیوں نے دوریدی کو اپنی مشترکہ استری بنا لیا، حالانکہ ایک بھائی ارجن نے اسے جیتا تھا۔ اگر دروپدی کے اولاد ہوتی تو وہ کس کی کہلاتی؟ کیا تمھارے خیال میں ایسا کرنا مناسب ہے؟ اور کیا ارجن اسے صرف اپنی بیوی بناتا تو دوسرے بھائی اس سے جلتے کہ یہ عیش کر رہا ہے؟

۱۲۔ مادری اور پدری نظام کی وضاحت کرو۔ تمھارا اپنا نظام کیا ہے، اور کیوں؟ اپنے نظام کے فوائد اور نقصانات بیان کرو۔

دوسرا ضروری نوٹ: ایک وقت میں ایک سوال کا جواب دو اور پہلے ضروری نوٹ کو اچھی طرح دوبارہ سہ بارہ پڑھو۔

Scanned with CamScanner

انتخاب

اکرام اللہ

کا مکمل ناولٹ

سوا نیزے پر سورج

rekhta

Scanned with CamScanner

اکرام اللہ

ملتان میں پیدا ہوے۔ پرورش اور تعلیم بھی وہیں ہوئی۔ آج کل لاہور میں ایک انشورنس کمپنی سے وابستہ ہیں۔ ان کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ "جنگل" جدید اردو کہانی سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کے لیے ایک خوش گوار حیرت کا سبب بنا۔ ایک ناول "گرگ شب" لاہور سے شائع ہوا، اور کچھ عرصے بعد ضبط کر لیا گیا۔کہانیوں کا ایک اور مجموعہ زیر ترتیب ہے۔

اکرام اللّٰہ

سوا نیزے پر سورج

صاف شفّاف دھوپ میں دونوں طرف حدِّ نظر تک شیشم میں ڈھلے ہرے بھرے کھیت پھیلے تھے۔ ٹرین شیشم اور کیکر کے درختوں میں سے چھک چھو چھک چھو کرتی مزے سے چلی جا رہی تھی۔ دور کہیں کہیں کھجور کا کوئی پیڑ، جو آسمان کی طرف لمبا کھنچتا چلا گیا تھا، نظر آ کر گزر جاتا۔ ہم سامان لادنے سے ہَفے، نشستوں پر ٹیڑھے میڑھے نیم دراز پڑے تھے۔ ایک بی شہر میں مسلسل رہتے، جھلستی لُو کھاتے، چلچلاتی دھوپ جھیلتے، پکھلی کولتار والی سڑکوں پر چھت سے پائیدانوں تک کالے پردوں میں لپٹے تانگوں کا بائیسکلوں پر تعاقب کرتے کرتے مایوس ہو کر ہم نے پہاڑ پر جانے کی ٹھانی تھی۔ تانگوں کے پردوں میں بند لڑکیوں اور عورتوں کے سر کبھی کبھی پُھدکتے نظر آ جاتے، جیسے کپڑے کے تھیلا نما پنجروں میں بند بٹیروں کے سر۔ جب وہ پھدکتے تو پنجرے کے کپڑے سے ٹکراتے نظر آتے جنھیں بٹیروں کی لڑائی کے شائقین اپنے ہاتھوں میں لٹکائے سڑکوں پر ہر صبح و شام عام گھوم رہے ہوتے۔ قسمت کبھی یاوری کر جاتی تو پردے میں غالباً دانستہ کیے گئے مہین سوراخ میں سے ایک خوفزدہ بھنورا سی کالی آنکھ باہر جھانک رہی ہوتی، جو کچھ دیر تو ڈھٹائی سے ہماری بھوکی نظروں کی تاب لاتی اور پھر گھبرا کر پیچھے ہٹ جاتی۔ باوجود اتنی مشقت کے ہم نے ان پردوں میں سے پورا چہرہ تو کیا، وہ بھنورا سی کالی آنکھ بھی کبھی پوری نہ دیکھی! اور یہ بھی کبھی پتا نہ چل سکا کہ دیکھنے والی کی وہ آنکھ دائیں تھی کہ بائیں۔ تانگے کے بمپر پر بیٹھا ہیبت ناک مونچھوں والا کوچوان تانگا چلا رہا ہوتا۔ اسے نشست پر بیٹھنے کی اجازت نہ تھی، چاہے تانگے میں ایک ہی سواری کیوں نہ ہو اور وہ بھی پچھلی نشست پر بیٹھی ہو۔ پیچھے پائیدان کے پاس، پردے سے باہر، فرش پر ایک چھوٹی سی غلیظ نوکرانی آلتی پالتی مارے بیٹھی ہوتی۔ اس کے ہمیشہ پھٹے بدرنگ کپڑے ہوتے اور سر پہ دھول مٹّی سے اَٹے بالوں کا جھاڑ جھنکاڑ ہوتا۔ وہ اپنے خیالوں میں گم، پتا نہیں کہاں اڑ رہی ہوتی۔ شدید گرمی سے بےحال، ایک ہانپتا کانپتا مظلوم گھوڑا اس سارے بوجھ کو کھینچتا جا رہا ہوتا، جس بوجھ کا آپس میں دور کا بھی کوئی سمبندھ نظر نہ آتا۔ ان میں سے ہر ایک، اسی ایک گھر جا رہا ہوتا

rekhta

Scanned with CamScanner

مگر لگتا کہ ان میں سے ہر ایک کی منزل الگ الگ ہے۔ وہ قریب قریب ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے سینکڑوں میل کے فاصلے پر ہوتے۔ شاید اصل حقیقت بھی یوں ہی تھی۔

ہمارے شہر میں گرمی کی غیر معمولی تیزی اور تیکھے پن کے بارے میں یہ روایت مشہور ہے کہ پرانے زمانے میں وہاں ایک فقیر شاہ شمس نامی ہر وقت جذب و کیف کے عالم میں شہر کے آس پاس بن بیلوں میں گھوما کرتے۔ من کی موج ہوتی تو کبھی شہر میں بھی آ نکلتے۔ انھیں کھانے پینے کا کچھ ہوش نہ تھا۔ بدن پر جگہ جگہ زخم اور زخموں میں کیڑے۔ بُو ایسی کہ کوئی قریب نہ پھٹک سکے۔ رحم دل اتنے کہ جو کیڑا زخم سے گر جاتا اسے اٹھا کر پھر زخم میں ڈال دیتے کہ میرا جسم اس کا رزق مقرر ہے تو یہ حصے سے کیوں محروم رہے۔ ایک مرتبہ پتا نہیں کتنے برسوں کے بعد کھانے کی طلب دل میں جاگی۔ کہیں سے ایک مچھلی مل گئی۔ اب اسے پکانے کے لیے جگہ جگہ لیے پھرے۔ بھرے شہر میں کوئی بھاڑ والا، کوئی بھٹیارن، کوئی زن، کوئی مرد اس پر راضی نہ ہوا کہ ان کی مچھلی بھون دے۔ جہاں گئے ہر کسی نے ناک پر کپڑا رکھا اور دھتکار دیا۔ سارا شہر گھوم گئے مگر کسی نے مچھلی بھون کے نہ دی۔ مایوس ہو کر سورج کی طرف دیکھا کہ یہ دنیا والے تو اتنے تلطف پہ بھی آمادہ نہیں، اور ہم اس ظالم دل کے کہے میں آ کر طلب کر ہی چکے ہیں تو اب تُو ہی ہم نام ہونے کی کچھ لاج رکھ۔ سورج ان کی مچھلی بھوننے کے لیے سوا نیزے پہ آن ٹھہرا۔ مخلوقِ خدا پھڑک کے رہ گئی۔ ہر کہہ و مہ پاؤں پر آن گرا کہ حضرت بس، اب رحم کیجیے۔ جلتے بھنتے بےبس انسانوں کی ہاہاکار سنی تو گویا سوتے سے چونک پڑے۔ سورج سے کہا۔ "ابے تُو واقعی زمین پر چلا آیا۔ چل واپس۔" وہ پلٹ کے آسمان میں پھر اپنی جگہ پہ جا لگا۔ مچھلی تو بھن گئی مگر اس روز سے وہاں گرمی کا یہ معمول ٹھہر گیا کہ گویا سورج ابھی سوا نیزے سے پلٹا ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ لوگوں کے مزاج میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہو سکی۔ اب بھی جب تک کوئی اپنی طاقت و اختیار کا سورج کھینچ کے سوا نیزے پر نہ لائے، اس کی بات سننے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ ایسی سحر دوپہروں میں جب سورج ابھی سوا نیزے پر اٹکا کھڑا ہوتا تو ہم تانگوں کے تعاقب میں بلکان ہو رہے ہوتے۔ سُونی سڑکوں پہ بوڑھی، یا ایسی عورتیں جن پہ جوانی کا بھرپور سیلاب لمحہ بھر کے لیے آ کر اپنے پیچھے بھوک اور افلاس سے ڈھیتا بدن چھوڑ کر تیزی سے اترتا جا رہا ہو، دو تین ننگ دھڑنگ بچے پیچھے لگائے ڈھول میں دیسی چمڑے کا سلیپر لگا جوتا، جس میں بمشکل پنجہ اڑ سکتا، پاؤں میں آرسے، سٹر پٹر کرتی، ڈھول اڑاتی اپنے گھروں کو جا رہی ہوتیں۔ میلے دوپٹے میں لپیٹ کر دو روٹیوں کے اوپر خربوزے کی ایک آدھ پھانک سر پہ دھری ہوتی۔

ان کا نیلی زمین پہ کالی اور سرخ دھاریوں والا، بھاری گھیر کا تنگ سا پاجامہ ہوتا، جس میں دونوں طرف ٹخنوں کے پاس ایک ویسا ہی میلا سفید پھندنا پھڑک رہا ہوتا۔ ہاتھ میں دال کا پیالا ہوتا، جس میں اس کے ننگے بھوکے بچے باری باری ضد کر کے ایک ایک بار ضرور چھانک کر دیکھتے۔ تانگا جب سواریاں لے کر منزل پر پہنچتا تو کوئی پندرہ پندرہ فٹ اونچی دیواروں کے احاطے کے اندر عمارت کے سامنے۔ جن حویلیوں کی ڈیوڑھیاں گلی میں ہوتیں وہاں نوکر دوڑ کر

گلی کے دونوں طرف چادر بلند کر کے تانگے کی طرف پیٹھ کیے پردے کرتے۔ گلی میں چلتے راہگیر انھیں قدموں پر رک کر انتظار کرتے، جب تک بیبیاں حویلی کے اندر نہ پہنچ جاتیں۔ تمام مرد ملازم اپنا کھانا پینا وہیں چھوڑ کر حُجروں سے نکل کر مع کوچوان کے ایک بھگدڑ کے عالم میں بھاگتے ہوئے سڑک یا گلی میں نکل جاتے، جیسے کوئی آفت نازل ہو گئی ہو۔ پھاٹک بند کیا جاتا۔ نوکرانیاں تانگے پر سے پردہ اتارتیں، جن میں سے بعض حیرت ناک حد تک حسین ہوتیں، کیونکہ ان کی رگوں میں بھی انھی مالکوں کا خون دوڑ رہا ہوتا جن کی بیبیوں، یعنی اپنی ہی بہنوں بھتیجیوں، کے تانگے پر سے وہ پردہ اتارنے پر مامور ہوتیں۔ بیبیاں تانگے سے اتر کر حویلی میں جاتیں اور حویلی میں جا کر کہیں غرقاب ہو جاتیں۔ ہم، جو ہر صبح اپنے اوپر لڑکیاں عاشق کرانے نکلتے تھے، سال دو سال تو امید کی ڈور تھامے رہے۔ بالآخر ہماری انا نے مایوسی کا بھرپور زخم کھا کر بےطرح اودھم مچایا۔ متوقع عاشقوں کا یہ عالم کہ کبھی ایک سے دوسری آنکھ نہ دکھا سکیں، اور ادھر معشوقوں کے شوق کا یہ عالم کہ جوئے شیر تو لانا ممکن، مگر صبح سے شام کرنا محال۔ علاجِ دلِ ناشاد کے طور پر حسنِ رابگزر، خُنک ہوا اور درختوں کی گھنی چھاؤں تجویز ہوئی، اور یہ سب اجزا پہاڑ کے علاوہ اور کہاں یکجا میسّر ہو سکتے تھے۔ چل پڑے۔ سنسناتی ٹھنڈی ہوا، ریلا در ریلا، جیون سکھ لٹاتی ڈبے سے گزر رہی تھی، اور ہم نیم خوابیدہ سے پڑے تھے۔ سکھ کو سپنے سے شاید اسی لیے تشبیہ دی جاتی ہے کہ دونوں سوتے میں وارد ہوتے ہیں اور سوتے ہی میں ہمیں چھوڑ کر رخصت ہو جاتے ہیں۔ سسّی اپنے جیون کے سکھ پنّوں کے بارے میں ماں سے شکایت کرتی ہے:

مینوں سُتی نوں چھڈکے ہوگیا رابی
مائے نی میری اکھ نہ کھلی

بیچاری سسّی، یہ نہ جانتی تھی کہ اس کی اکھ سدا لگی رہنے ہی میں اس کا بچاؤ تھا؛ یوں اس کا پنّوں ہمیشہ اس کے پاس رہتا، اگر اس وقت اکھ کُھل بھی جاتی تو پنوں کو، جب اس کا جانا ٹھہر ہی چکا تھا تو، بہرصورت چلا ہی جانا تھا۔ یہ نیند بھی کیسا بھید ہے جو سب کے جینے کا بھرم بنائے رکھتا ہے۔

ڈگا ڈگ ڈگ، ڈگا ڈگ ڈگ۔ گاڑی پل پر سے گزر رہی تھی۔ ہم ساتوں کھڑکیوں سے اُبل پڑے۔ تیز دھوپ میں زنگ کے رنگ کے پینٹ والے موٹے موٹے آہنی گرڈر ایک دوسرے کو آڑا ترچھا کاٹتے اوپر ہی اوپر جا رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ پل ایک پنجرہ ہو اور ہم مع گاڑی کے اس میں بند ہو گئے ہوں۔ کبودی رنگ کے آسمان پر سورج اپنی آغوش میں بھڑکتا ہوا جہنّم سنبھالے زمین پر غور سے دیکھ رہا تھا۔ افق تک پہنچتے پہنچتے آسمان اور مٹیالا دریا ایک ہو گئے تھے۔ ہر طرف پانی ہی پانی، سیکڑوں مٹیالے بھنوروں کی پُرخروش آوازوں سے پھنکارتا، آسمان کو للکارتا، تیزی سے بہتا جا رہا تھا۔ وہ پانی جسے ہم جانتے تھے، وہ تو نلکے سے ایک ننھی مٹی دھار میں نکلتا، یا برتن میں مضطرب سا پڑا چھلکتا رہتا، یا گندی نالیوں میں ایک ذلیل سی چیز بنا ذلّت سے سر جھکائے بہتا رہتا۔ وہ ہمارا محکوم، ہمارا تابع، ہمارا خادم، ہمارا غلام پانی تھا۔ وہ تو ایک

Scanned with CamScanner

بےضرور ناقابلِ توجّہ چیز ہوتی تھی۔ مگر یہ پانی کا انبوہِ بےاماں ۔ الاماں! یہ پانی کا لامتناہی ہجوم بےدرماں ۔ الاماں! یہ سب کیا ہے؟ کیوں ہے؟ خوف سے ہمارے روئیں روئیں سے جیسے جان نکلی جا رہی تھی۔ دریا کی خروشِ وغا نے ہمارے کان بہرے کر دیے تھے۔ ہماری زبانیں گنگ تھیں، حواس باختہ تھے، مگر جراٴت سے کھلی آنکھوں سے ہم اس ہیبت ناک نظارے کو پی رہے تھے، کیونکہ پیتے جانے پر مجبور تھے، اور ڈرتے کانپتے جاتے تھے۔ یہ پانی قطعی نہیں ہے۔ بس دریا ہے۔ لیکن اگر انگلی ڈبو کر، نکال کر دیکھو گے تو وہی ایک ایک قطرہ نکلے گا جن سے دریا بنا ہے۔ وہ اپنے غیض و غضب سے لجڑتے لمس سے زندگی کو ڈس کر بھسم کرنا چاہتا ہے تاکہ پھر زمین اسی زہریلے لمس سے تازگی پا کر حیاتِ نو سے روئیدہ ہو۔

گیتا دت کی تِنتناتی آواز، جو اپنے اندر زندگی کے ان لمحوں کا طنطنہ رکھتی ہے جو موم کی طرح بدنوں کو پگھلا دیا کرتے ہیں، مگر وہی آواز جب میرا کا بھجن گاتی ہے تو "ہونی" کو ایک فلسفیانہ طریق میں اپناتے ہوئے، سلگتے ہوئے چندن کی سرخ ڈھیری کا سوز اپنے میں شامل کر لیتی ہے۔

زندگی کی جانب سے بُوم نے گیتا کا گایا ہوا میرا بائی کے بھجن کا ایک مصرعہ اپنی سریلی آواز میں گایا،

آج سجن موہے انگ لگا لو، جنم سپھل ہو جائے

خچر نے جیب سے مٹھی بھر سکّے نکال کر ایک چھناکے سے دریا میں پھینکے۔ وہ تنومند گرڈروں سے ٹکراتے چھن چھناتے دریا میں جا گرے۔ پھر چھ چھناکے اور ہوئے۔ پل گزر گیا، ڈگا ڈگ بند ہو گئی۔ ہم نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ گاڑی سانپ کی طرح بَل کھاتی پُل کے بِل میں سے نکلی آ رہی تھی۔ لائن کے دونوں طرف پھیلے بڑے بڑے جوہڑ تھے۔ سرکنڈوں کی بلند جھاڑیاں تھیں۔ جوہڑوں کے کنارے بڑ جیسے تن و توش کے شیشم کے درختوں تلے لوگ کنڈیاں ڈالے مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔ دور پر اس خطۂ زمین کی خاص سوغات آموں کے باغ تھے، اور وقت کی گیلی مٹی پہ محمد بن قاسم کے پاؤں کے نشانات کے طور پر عربوں کے ایلچی بنے، کھجوروں کے جُھنڈ کے جُھنڈ ہمارے ساتھ دوڑتے آ رہے تھے ۔ ہم اس پوری کیفیت سے دہلے ہوئے اپنی اپنی نشستوں پر خاموش اپنے خیالوں میں ڈوبے بیٹھ گئے۔ ہماری موٹی موٹی پلّی ہوئی اَنائیں، جو اپنے مفروضہ زخموں سے ہمہ وقت جھلائی جھلائی رہتی تھیں، اب دبک کر خاموش ہو گئی تھیں۔ ہمیں احساس ہوا کہ ان کا مطالبہ کتنا احمقانہ اور فضول سا تھا۔ کچھ دیر تک ڈبے میں ویسی ہی ایک بوجھل سی خاموشی طاری رہی، اور گاڑی چلتی رہی۔ پھر خواب جیسی فضا کو توڑتے ہوئے فیزنٹ بولا، "یار! ایسے تو ہندو دریاؤں میں پیسے پھینکا کرتے تھے۔ ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

خچّر کہنے لگا، "کوئی بات نہیں۔ بڑائی جب اتنی بڑی ہو تو اس کو مانتے ہوئے کچھ تو کرنا چاہیے، چاہے اس میں ہندوؤں کی نقل ہی کیوں نہ ہوتی ہو۔"

بوم نے بتایا، "ایک زمانہ تھا جب نیل کی نذر ہر سال مصر کی خوبصورت ترین کنواری لڑکی کی جاتی تھی۔"

فیزنٹ نے ران پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا، "ارے احمق! پہلے بتایا ہوتا۔ میں آج اپنے ملک کا

خوبصورت ترین کنوارا لڑکا "چوزہ" مع اس کی آرزو جیسی پشت کے اس دریا کی نذر کرتا۔"

سب ہنس دیے۔ چوزہ شرمایا۔ نسوانیت اس کی پور پور میں سے لہراتی ہوئی نکل گئی۔ نیلی نیلی سی مسّوں والا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ایک بار اس نے بوم کی طرف دیکھا، اور پھر سب کو ہنستے دیکھ کر پھیکی پھیکی سی ہنسی ہنسنے لگا۔ بوم کا دل یک بارگی اسی طرح زور زور سے دھڑک اٹھا جیسے پچھلے کئی مہینوں سے چوزے پہ ذرا سی زد پڑنے پہ دھڑک اٹھتا تھا۔ اس نے گھبرا کے چوری چوری اِدھر اُدھر دیکھا کہ کسی نے بھانپا تو نہیں۔ اطمینان ہوا تو سنبھل کے بیٹھ گیا۔

زاغ نے کہا، "دریا کو صرف چاندی کے سکّے پیش کیے جاتے ہیں۔ چوزے، مجھے پتا ہے تیری جیب میں کچھ تانبے کے پیسے بھی تھے۔ وہ بھی پھینک دیے؟"

"ہاں۔"

زاغ نے اٹھ کے جا کر اس کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا، "میری جان، تو نے بُرا کیا۔"

چوزے کی بڑی بڑی شربتی آنکھیں ہراساں سی زاغ کے چہرے پہ گڑی تھیں؛ "مگر اس میں برائی کیا تھی؟"

"تو نے چاندی کی بجائے تانبا بھینٹ کر کے دریا کا اپمان کیا ہے۔ اب وہ بدلہ لے گا۔"

فیزنٹ نے آواز لگائی، "زاغ، یوں بہانوں سے چوزے کو چُھونے کی کوشش مت کرو۔ ہاتھ ہٹا لو، ورنہ ڈوئل کے لیے تیار ہو جاؤ۔" زاغ نے چونک کر فوراً ہاتھ ہٹا لیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

بوم کو، جو زاغ کے یوں بیٹھنے پہ دل ہی دل میں کسمسا رہا تھا، زاغ کے اٹھنے اور بازو ہٹانے پہ گویا چین سا آ گیا۔

ان دنوں ہم پہ الگزنڈر ڈیوما کا ناول "تھری مسکیٹیرز" بری طرح سوار تھا۔ بات بےبات ڈوئل کے چیلنج پھینکے جاتے۔ تلوار اور پستول تو ہمارے پاس تھے نہیں۔ ہم ڈوئل کی پیروڈی کرتے ہوئے گھونسوں سے لڑا کرتے۔ چند مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ فریقین اپنی مفروضہ توہین پہ اس طرح جم کے لڑے کہ نوبت مرہم پٹّی تک پہنچی۔ ایک بار خرعینے اپنے کسی کزن کی بڑائی بیان کر رہا تھا، کہ وہ ہر روز شکار پہ جاتا ہے اور صرف شکار ہی کا گوشت کھاتا ہے، اگر کسی روز شکار نہ ملے تو گوشت نہیں کھاتا؛ دراصل بارود کی بُو گوشت میں تحلیل ہو کر اس میں اپنا ایک ذائقہ پیدا کر دیتی ہے، اسے بس وہ پسند ہے۔ اس کی یہ تھیوری اگرچہ ہم ہضم تو نہ کر سکے، لیکن جُھٹلانے کے لیے کسی کو کوئی بات بھی مل نہ رہی تھی۔ لحظہ بھر خاموشی رہی۔ آخر کو خچّر بولا، "یار! یہ ایسی کون سی مشکل بات ہے! پاؤ بھر گوشت پوٹلی میں باندھ کر درخت لٹکا دیا کریں، اور پھر اسے گولی مار کر کھا لیا کریں۔" بڑی کِھل کِھلی مچی۔ خرعینے بہت جھینپا۔ جب ہنسی کسی طور تھمنے میں نہ آئی تو وہ مٹھیاں بھینچ کر کھڑا ہو گیا اور للکارا، "خچر تیار ہو جا۔ ڈوئل ہو گی، ابھی اور اسی وقت!" تماشے کے شوق میں کینٹین میں کرسیاں جلدی جلدی دیواروں کے ساتھ لگا دی گئیں، اور ناظرینِ باتمکین بہ اطمینانِ تمام لطف اندوز ہونے کے لیے ان پر متمکّن ہو گئے۔ خچّر کو بھی مجبوراً اٹھنا پڑا۔ پہلے تو دونوں خالی ہوا میں گھونسے چلاتے رہے، پھر مُگدر جیسے مضبوط اور تھکتے خرعینے کے گھونسے ہدف پہ پڑنے لگے۔ شروع میں خچّر پٹتا ہوا جیسے تیسے

Scanned with CamScanner

گئے تو پردیس میں کیا کریں گے؟"

"ٹھیک بات کہتے ہو۔ تم نہ کھیلو۔ لیکن میرے پاس بھی تم جانتے ہو صرف بیس ہی روپے ہیں۔ شرط ہی یہ تھی کہ کوئی بیس روپے سے زیادہ ساتھ لے کر نہ چلے۔ فیزنٹ، خرعیسنے اور زاغ نے یقیناً بدعہدی کرتے ہوئے چھپا کر سینکڑوں روپے رکھے ہوں گے۔ لیکن یہ خچّر سالا کہاں کا رئیس ہے، اس کے پاس بھی بیس ہی ہوں گے یا زیادہ سے زیادہ تیس ہوں گے"، بات کرتے میں اب اس کے چوڑے نتھنے پھول کر اور چوڑے ہو گئے تھے۔ اس کے اوپر کے ہونٹ پر ترشی ہوئی تلوار مارکہ مونچھیں بہت تیزی سے ہر طرف تلوار زنی کرنے لگیں۔ اس کی سیاہ چمک دار پُتلیاں بوم اور چوڑے کی خاموش ٹھہری ہوئی آنکھوں میں تیزی سے باری باری جھانکتیں، اور لحظہ بہ لحظہ پہلے سے زیادہ چمکنے لگتیں، حتی کہ وہ ایک برقی طاقت سے لش لشانے لگیں۔

"دیکھو! دنیا میں چانس لیے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔ تم دونوں پانچ پانچ ڈالو، میں دس ڈالتا ہوں۔ جو جیت ہو گی وہ تین حصوں میں بانٹ لیں گے۔ سنا ہے نا؟ برابر برابر۔ اگر ہار ہوئی تو ہم تینوں چالیس روپے پُول کر لیں گے۔ خرچ اکھٹا رکھیں گے تو تیرہ تیرہ روپے میں ہمارا گذارہ آسانی سے چل جائے گا۔ سگریٹ مَیں تمہیں خرعیسنے سے بٹور دوں گا۔ سمجھے نا؟ ہارو تو تمہارے صرف دو دو روپے کا نقصان ہو گا، اور جیت بڑی بھی ہو سکتی ہے، اتنی بڑی کہ ہم پورا ہفتہ عیّاشی سے گزار دیں۔ تم دیکھنا، میں منٹوں میں ان کے سر نہ مُونڈ لوں تو چتر نام نہیں۔"

چوڑے نے پوچھا، "کیا خیال ہے بوم؟"

بوم نے کہا، "ٹھیک ہے۔"

دونوں نے جیبوں میں ہاتھ ڈالے، میلے میلے سے رومال نکالے، اور ان میں کاغذ کے اندر احتیاط سے لپیٹ کر رکھے نوٹوں میں سے پانچ پانچ گن کے کانپتے ہاتھوں سے چتر کے حوالے کر دیے۔ اس نے جَھٹ سے جیب میں ٹھونسے، اور پُھرتی سے جا کر خرعیسنے کے سامنے بیٹھ گیا، "ہاں جی - بانٹو؟"

زاغ نے کہا، "پہلے کھیل کی شرائط طے کر لو تاکہ بعد میں چَخ چَخ نہ ہو۔ ایک آنہ بورڈ، ٹھیک ہے؟"

تینوں بولے، "ٹھیک ہے۔"

خچّر نے کہا، "دو آنے لازمی بلائنڈ، لیکن چار آنے سے زیادہ نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔"

خرعیسنے نے پوچھا، "کیوں بھئی سب سے بڑی راؤنڈ لنگڑی، یعنی دو تین پانچ، چلے گی؟"

چتر نے کہا، "لیکن بادشاہ، بیگم اور یکے سے چھوٹی ہو گی۔ ہاں ٹریل پر سلامی رکھنی ہے؟"

"ہاں! رکھو، رکھو۔"

"سادہ پہ چار چار آنے اور تصویروں والی پر آٹھ آنے۔"

خچّر نے کہا، "یہ زیادہ ہے۔ دو آنے چار آنے رکھو۔"

چتر نے تیوری چڑھاتے ہوئے کہا، "چھوڑ یار۔ کھیلنا جُوا اور بچانے پیسے! چلنے دو۔ دیکھا جائے گا جو ہوگا۔" بوم سے چتر کا یہ Reckless اور Fatalistic انداز دیکھا نہ گیا۔ گھبرا کر

بےدَمی سے لڑ رہا تھا، آخر اس کو بھی تیز ہونا پڑا۔ خچّر نے لڑتے لڑتے پلٹ کے مخالف سمت پر دولتّی جھاڑنے کی کوشش کی۔ اسی لیے اسے خچّر کے خطاب سے نوازا گیا۔ مگر دولتّی پڑی چوڑے کی پیشانی پر، جو زمین پہ جھک کے جیب سے گرا ہوا قلم اٹھا رہا تھا۔ خون اُبل پڑا۔ اس کا ناظرین اور متقابلین کو بےحد افسوس ہوا۔ خچّر کو لعن طعن کی گئی۔ بُوم پریشانی اور رنج میں ڈوبا، روہانسی صورت بنائے، اسے فوراً سائیکل کے ڈنڈے پہ بٹھا کر ہسپتال کی طرف لے کر دوڑا۔ چوڑے البتہ ہمہ وقت ہنستا رہا۔ یوں خونِ معصوم نے بہہ کر معاملہ کو ختم کر دیا۔ ہم ایسی لغو اور بےمعنی بحثوں میں الجھتے رہتے جو لمبی ہوتے ہوتے جھگڑے پر اور کبھی ڈوئل پر منتج ہوتیں۔ ہم میں سے کسی میں رتّی برابر تحمّل نہ تھا۔ کسی کا نقطۂ نظر سمجھنا تو دور کی بات ہے، سننے کی تاب نہ تھی۔ خچّر، بُوم، چتر اور چُوڑہ بزعمِ خویش سوشلسٹ انقلاب کے داعی تھے، اور دوسری طرف زمیندار طبقے سے تعلق رکھنے والے خرعیسنے، زاغ اور فیزنٹ سرمایہ داری نظام کے حامی تھے۔ ہرچند کہ زاغ نے اپنے باپ کی موت کے بعد اکلوتے بیٹے کی حیثیت سے صرف تین چار مربع اراضی وراثت میں پائی تھی، اور خرعیسنے اور فیزنٹ اسے چھوٹا مالک ہونے کے باعث بہت حقیر اور کمتر سمجھتے تھے، بلکہ مخالف گروہ، جسے وہ اپس کی بات چیت میں موچی پاولی گروہ کے نام سے یاد کرتے تھے، زاغ کو بھی انھی کے زُمرے میں رکھتے تھے، لیکن زاغ اپنے آپ کو زمیندار گردانتا تھا اور زمیندارہ سسٹم کا ان سے بڑھ کر حامی اور وکیل تھا۔ دونوں گروہ ان فلسفوں کا کوئی باقاعدہ علم نہ رکھتے تھے، اور نہ جاننے کی کوشش کرتے تھے، جن کے وہ موئید تھے، لیکن جذباتی نعرےبازی میں خوب تیز تھے۔ فیزنٹ کا معاملہ دوسروں سے یوں مختلف تھا کہ وہ بڑا جَری اور دبنگ لڑکا تھا اور اس کا چیلنج قبول کرنا ذرا ٹیڑھی بات تھی۔ چند ماہ پہلے وہ سنیما کا آخری شو دیکھ کر اپنے ایک ملازم کے ہمراہ، جو اس کا دوست اور مزارعوں کی بیٹھوں کو ڈیرے پہ بلانے میں رازداں تھا، سنیما ہال سے نکلا تو ایک بدمعاش نے انجانے میں اسے ایک خوبصورت لونڈا سمجھ کر اس کا بازو پکڑ لیا، "بادشاہو! آؤ ناں! اج ذرا ساڈے ڈیرے تے وی بہو!" اس نے جھٹکے سے بازو چھڑا کر ایک گھونسا اس کے منہ پر دیا۔ وہ چوٹ کھا کر جھپٹا۔ اس نے چاقو سے اُس کے سینے پر وار کیا، جو اس نے اپنے کندھے پر لیا اور خون بہاتا اپنے ساتھی سمیت، جس سے ملازم نپٹ رہا تھا، رفوچکّر ہو گیا۔ فیزنٹ بارسوخ امیروں کا بیٹا تھا، بات آگے کیا بڑھتی۔ بدمعاش نے دوسرے دن بنگلے پر آ کر زمین پر ناک رگڑی تو اس کی خلاصی ہوئی۔

خچّر صرف ایک نیکر پہنے، ہاتھ میں تاش کی گڈی لیے، ننگےپاؤں کھڑا دعوتِ مبارزت دے رہا تھا، "پیسے نکالو اور آ جاؤ۔" وہ سیٹ پر آلتی پالتی مار کے بیٹھ گیا۔ اس کے سامنے زاغ نے آسن جما لیا۔ خرعیسنے بھی تیار ہو گیا۔ فیزنٹ نے کہا، "مجھے تو بھائی نیند آ رہی ہے"، اور اوپر کی برتھ پر لیٹ گیا۔

"تم ذرا پتّوں کے لیے سیٹ پر تولیہ بچھاؤ، میں بھی شامل ہوں گا"، یہ کہتے ہوئے چتر اٹھا، اور بوم اور چوڑے کو کونے میں لے جا کر کہنے لگا، "تم لوگ کھیلو گے؟"

"نہیں۔ ہمارے پاس تو صرف بیس بیس روپے ہیں۔ اگرچہ واپسی کا ٹکٹ تو ہے، لیکن راستے کا خرچ، پہاڑ پر ایک ہفتے کا قیام، سب اسی میں پورا کرنا ہے، اور پھر سگریٹ بھی پینے ہیں۔ ہار

Scanned with CamScanner

چوزے کی طرف دیکھا۔ اس نے ہونٹ دبا کر ہر چہ بادا باد کا اظہار کیا۔ بوم چوکڑی سے الگ ہو کر پرے جا بیٹھا، سگریٹ سلگایا، اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ ریت کے ٹیلوں کے درمیان پھنسے زرد رُو چھدری چھدری فصلوں کے کھیت کہیں کہیں نمودار ہو کر پھر گم ہو جاتے۔ ریت کے ذرے اڑا کے لاتی ہوا میں اب تپش سی محسوس ہونے لگی تھی۔ ریل کا وہ چھوٹا سا ڈبا بلاشرکتِ غیرے ہمارے اور ہمارے سامان کے تصرّف میں تھا۔ باہر کھلنے والے دو دروازوں کے بیچ، دیوار کے ساتھ ایک بڑا تھیلا "ہنستے بدھ" کی مصداق پیٹ پھلائے بیٹھا تھا۔اس میں سات گھروں سے جمع کیے ہوئے سات رنگ آٹے، دالوں اور نمک، مرچ، مسالے وغیرہ کی پوٹلیاں بند تھیں۔ ہمیشہ "ہنستا بدھ" آج ہنس نہیں رہا تھا۔ شاید وہ اپنی حیثیت سے زیادہ کھا گیا تھا، اس لیے فوت ہو گیا تھا اور ہنسنے سے معذور تھا۔ سات سوٹ کیس، کپڑوں اور گرم کوٹوں سے پھٹے پڑتے، فرش پہ بکھرے ہوئے تھے، جیسے خون پی پی کر سوجی ہوئی جونکیں مٹی پہ اِدھر اُدھر بکھری پڑی ہوتی ہیں۔ ایک ایک کمبل اور گدّے سے ٹھنسے سات بستر دفنانے کے لیے تیار لپیٹ کر رکھی میتیں تھیں۔ پلی پلی کر کے جمع کیا ہوا گھی کا کنستر، کہ جہاں رکھو اپنے بےچہرہ پیندے کا نقش اجاگر کر دے، مرے ہوئے "لافنگ بدھا" کے پاس پتھر سا دھرا تھا۔ وہ ایسی بےجان چیز تھی جیسے کبھی بھی زندگی سے آشنا نہ رہی ہو۔ برتنوں سے بھری بوری برابر پڑی مستقل دھیمے سُروں میں ٹن ٹن، ٹک ٹک کیے جا رہی تھی۔ پہلی نظر میں برتنوں کی گولائیاں باہر سے یوں نظر آتیں جیسے بوری، چھوٹے بڑے مختلف سائز کے انسانی سروں سے بھری رکھی ہو۔

چتر نے کہا، "او چوزے! ادھر آ کے میرے پاس بیٹھ، اور جیسے نورجہاں کسی زمانے میں جہانگیر کے کندھے پر ہاتھ رکھا کرتی تھی، ویسے ہی ہاتھ میرے کندھے پر رکھ دے۔ پھر دیکھ جیت کیسے ہماری نہیں ہوتی؟"

چوزہ مسکرایا اور اس کے دونوں گالوں میں گڑھے ذرا اور گہرے ہو کر زیادہ خوبصورت ہو گئے۔ وہ کھسک کر چتر کے قریب ہو کر ہنسی ہنسی میں چھاتی اس کے کندھے سے بھڑا کر بیٹھ گیا اور انہماک سے اس کے پتّے دیکھنے لگا۔

زاغ نے کہا، "میری جان! اِدھر آ کر میرے پاس بیٹھ اور بس میری ران پر ہاتھ رکھ دے۔ جو ہاتھ بھی جیتوں آدھا تیرا۔"

چتر کا چوزے سے مذاق بوم کو معصوم سی چھیڑ چھاڑ نظر آیا۔ وہ دل میں مسکرایا اور عجیب طرح کے تفاخر سے اس کا سر ذرا سا اونچا ہو گیا۔ لیکن زاغ کے ویسے ہی مذاق سے خوف نے یک بارگی اس کے دل میں چوکس ہو کر کان کھڑے کیے، اور پھر اندر ہی اندر ہلکی ہلکی کڑواہٹ گھلتی اور پھیلتی گئی۔

خرعیسے نے کہا، "او چوزے، وہیں بیٹھے رہنا۔ چتر تو صرف مذاق کر رہا تھا، زاغ واقعی کچھ کر دکھائے گا۔ پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی؟"

پتّے مر رہے تھے، کٹ رہے تھے، کاٹ رہے تھے۔ دو گولے، بادشاہ اور یکّے پر حاوی تھے۔ اس پر کیا منحصر، تاش میں سب سے غریب اور بےحیثیت پتّے، دگّی، تگّی، چھکّی اگر ایک ہی رنگ کے ہوں، اور اکھٹے ہوں، تو بادشاہوں کیا یکوں کے جوڑے سے افضل تھے۔ کالے، سیاہ مونہوں والے اگر

اکٹھے ہوں تو گل فام چہروں کو شکست دے دیتے ہیں، اور اگر ساتھ ہی اکثریت میں بھی ہوں تو پھر تو تہس نہس کر کے رکھ دیتے ہیں۔ پتّوں نے ہر لحاظ سے وہاں بساطِ زندگی کا پورا بکھیڑا پھیلایا ہوا تھا۔

بوم گانے لگا،

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

چتر بولا، "بوم یار، تو وہاں اکیلا بیٹھا کیا فارسی کے شعر گا رہا ہے؟ ادھر آ کے ذرا بازی کا رنگ ڈھنگ دیکھ۔ تیری اسی فارسی دانی کی وجہ سے تیرا نام بوم رکھا گیا تھا، ورنہ تجھے سیدھا سادھا اُلّو بھی کہا جاسکتا تھا۔"

بوم نے کہا، "یہ شعر اردو کا ہے فارسی کا نہیں۔"

چتر نے خفّت مٹائی؛ "کوئی بات نہیں پیارے۔ اردو، فارسی، ایک ہی بات ہے۔"

چتر اردو، فارسی سے یکسر نابلد تھا۔ وہ یا تو اپنی مادری زبان سرائیکی بول سکتا تھا، یا پھر انگریزی، اور وہ بھی اس طرّارے سے کہ اینگلو انڈین اور انگریز بھی کیا بولتے ہوں گے۔ اس نے میٹرک کلکتّے کے کسی انگریزی اسکول سے پاس کیا تھا۔ اس کا باپ بہ سلسلۂ ملازمت ایک زمانے سے وہاں رہائش پذیر تھا، لیکن جب ملک تقسیم ہوا تو مع اپنے لمبے چوڑے خاندان کے واپس اپنے شہر میں آنا پڑا۔ آتے ہی ریٹائر ہو گئے۔ اتنے برسوں کی غیرحاضری کے سبب اب وطن ہی پردیس بن کے رہ گیا۔ کھانے والے اتنے ہی اور وسائل ناپید، نتیجتاً افرادِ خانہ یوں محسوس کرتے تھے جیسے عرش سے فرش پر آ رہے ہوں۔

چتر بوم سے کہہ رہا تھا، "ویسے سُنا ہے ایرانی اُلّو، پاکستانی الو سے سائز میں بڑا، اور نحوست میں قدرے کم ہوتا ہے۔ اسی لیے تجھ سے رعایت برتتے ہوئے تیرا نام بوم رکھا گیا تھا۔ مغرب میں پہنچتے پہنچتے تو تُو بالکل ہی فلاسفر بن گیا ہے۔"

چتر نے خرعیسے کے سامنے پڑا سگریٹ کا پیکٹ اٹھا کر ایک سگریٹ سلگایا، ایک چوزے کو پیش کیا، اور بوم کو آواز دی،

"ارے تو بھی یہ متبرک سگریٹ پی لے۔ ان کے مال میں اتنی برکت ہے کہ چار گھنٹے تک پھر طلب نہ ہو گی۔"

بوم نے انکار میں ہاتھ اٹھایا اور کھڑکی میں سر رکھے، آنکھیں بند کیے، گانے میں محو رہا۔ خرعیسے نے پیکٹ اٹھا کے جیب میں رکھ لیا۔ چتر نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا، "یار برا مان گئے؟ گولڈ فلیک کے دس پیکٹ سوٹ کیس میں رکھے ہیں۔ بھائی وہ بھی تیرے ہی ہیں۔ کہو تو سامنے ڈھیر کر دوں۔ میں تو ذرا اٹھنے کی سُستی کر گیا، ورنہ اور تو کوئی بات نہیں۔"

خرعیسے نے پتّے اٹھاتے ہوئے زیرِ لب کہا، "سگریٹ اپنے اپنے۔"

چتر دوسروں کی جیب سے سگریٹ پینے کا ماہر تھا۔ کالج کینٹین میں کبھی بھولے سے پیکٹ لے آتا تو ایک سگرٹ سلگا کر ڈبی لاپرواہی سے گھما کے کونے میں پھینک دیتا، جیسے خالی ہو۔ باقی وقت دوسروں کے لطف و کرم سے محظوظ ہوتا۔ جاتے وقت سب کی آنکھ بچا کے اپنی بھری

Scanned with CamScanner

ڈبّی انھا کے جیب میں ڈالتا اور گھر کی راہ لیتا۔ چتر ہاتھ مارا تو جھلا کے بولا، "چوڑے، تُو تو الگ ہو کے بیٹھ۔ کیا تماشا ہے؟ میں کوئی تیرا عاشق تھوڑا ہی ہوں جو تجھے ساتھ چمٹائے رھوں۔"

زاغ نے پانی پینا چاہا تو گھڑا خالی تھا۔ اسے سیٹ کے نیچے کھسکا دیا۔ گاڑی کی رفتار ہلکی ہوئی اور بریکیں چوں چاں کرتی لگنے لگیں۔ گاڑی کی چھت سے اونچا، درمیانے درخت کے تنے جتنا موٹا براؤن رنگ کا نل، جس سے انجن میں پانی بھرا جاتا ہے، پاس سے گزرا۔ ہم نے جانا کہ کوئی درمیانہ اسٹیشن آ رہا ہے۔ زاغ نے بوم کو مخاطب کر کے کہا، "تو وہاں فارغ بیٹھا مکھیاں مار رہا ہے۔ اس اسٹیشن سے پانی کا گھڑا ہی بھر لا۔"

وہ ٹس سے مس نہ ہوا، اور قمیض کے دامن سے چہرے کا پسینا پونچھ کر اسی طور، وحشی دھوپ کے تلے ٹیلہ در ٹیلہ پھیلے، چمکتی ریت کے سلسلے کو دیکھتا رہا۔ زرد رُو فصلیں، جو وقفے وقفے سے نظر آتی رہی تھیں، اب روٹھ کر کہیں پیچھے رہ گئی تھیں۔

چتر نے پوچھا، "زاغ! پانی ختم؟"

"ہاں۔ بالکل ختم۔"

چتر نے کہا، "بوم ، یہ قدرے بڑا اسٹیشن معلوم ہوتا ہے۔ یہاں پانی آسانی سے مل جائے گا اور مینھا ہو گا، کیونکہ انجن میں بھی پانی ڈالنے کا انتظام ہے۔ پھر پتا نہیں کہاں ملے۔ گرمی بہت ہے، پیاس سے مر جائیں گے۔" اس کے بعد خچر نے، پھر خرگیسنے نے اس سے کہا، مگر وہ چپ رہا۔ چوزے نے ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا، "تمھیں میری جان کی قسم، گھڑا بھر لاؤ!" سب ہنسے۔ بوم چڑ گیا، "بند کرو بکواس۔ میں کسی کے باپ کا نوکر نہیں ہوں۔ جو گھڑا تم پی چکے ہو وہ میں نے بھرا تھا، اور بغیر کسی کے کہے بھرا تھا۔ اب کوئی اور بھرے۔"

اسے یوں برافروختہ دیکھ کر سب بدمزہ ہو گئے اور محفل پر مُردنی چھا گئی۔ گاڑی ایک جھٹکے سے میلی کچیلی پکی اینٹوں کی عمارت کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ دو نیلی وردی والے عمارت میں گھس گئے۔ ایک وردی والا چبوترے پر لگے آہنی ڈنڈوں کو، اپنے جسم کا پورا بوجھ ڈالتے ہوئے، زور لگا کر کھینچنے لگا۔ جنڈ کا بھنچا بھنچا درخت، جو بونوں کے ہاتھ پاؤں جیسی ٹیڑی مڑی کوتاہ شاخیں رکھتا تھا، تنہا پلیٹ فارم پر کھڑا دھوپ میں سڑ رہا تھا، اور سایہ بمشکل اس کے اپنے کوزہ زدہ سے سفید پیچ خوردہ تنے کو ڈھانپنے کے لیے کافی تھا۔ فیزنٹ گرمی گرمی پکارتا ہرتھ سے نیچے اترا۔ خچّر دروازہ کھول کر دیکھ رہا تھا کہ شاید کوئی پانی والا بالٹی لیے پھر رہا ہو گا، مگر کہاں۔ کھدّر کے بدرنگ قرمچی کھاکھرے میں ایک بڑھیا، ایک ہاتھ سے بوجھل گٹھڑی گھسیٹتی، دوسرے ہاتھ میں اندھے بوڑھے خاوند کا ہاتھ تھامے، اسے کھینچتی گاڑی کے ساتھ ساتھ تیزی سے چلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بڑھیا نے گٹھڑی خچّر کے پاؤں کے قریب رکھی تاکہ ڈبے میں سوار ہو سکے۔ "پتّر، رات سے یہاں پڑے ہیں، بیٹھنے دے۔"

اندر سے سب یک زبان بولے، "مت چڑھنے دینا۔"

خچر نے گٹھڑی پاؤں سے نیچے لڑھکاتے ہوئے کہا، "مائی آگے چل، یہ فوجیوں کا ڈبّا ہے۔"

اگرچہ دوسری جنگ عظیم گزرے چار سال ہونے کو آئے تھے، لیکن یہ بہانہ جو فوجیوں کی عام شہریوں پر برتری کا کھلا اعلان تھا، اب بھی چلتا تھا۔ بلکہ اب تک تو وہ ایک جائز اور راست

حق کی حیثیت اختیار کر کے معاشرہ میں پوری طرح جذب ہو چکا تھا، اور عمومی نفسیات نے اسے مسلّمہ حقیقت مان لیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ممالک جو جنگِ عظیم میں ذاتی حیثیت سے شامل تھے، ان کے ہاں یہ استحقاق جنگ ختم ہوتے ہی اپنے آپ کالعدم ہو چکا تھا۔

مائی نے گٹھڑی اٹھاتے ہوئے پھر منّت کی، "ہر گاڑی میں ہر ڈبّا فوجیوں کا ہی ہوتا ہے۔ رات سے یہی کچھ ہو رہا ہے۔ بختوں والے، بیٹھ لینے دے۔"

چتر ٹھاٹھ سے بولا، "آگے چل مائی، آگے۔"

وہ گھبرا کے اگلے ڈبّے کی طرف لپکی اور بڈھے پر برس پڑی، "تو کتھائیں ٹُر، مر ہی سہی۔ میڈے بھا دا عذاب۔ ھُن ایہہ گاڈی ای نکل ویسی۔"

دکھ کے خُوگر کو سہتے سہتے آخر کو صبر آجاتا ہے، مگر دکھ چہرے پر اپنی گہری چھاپ بہرطور نقش کر کے رہتا ہے۔ بڈھا بھی ویسا ہی ایک چہرہ آسمان کی طرف اٹھائے، اور کان پلیٹ فارم پر لگائے، لاٹھی سے راہ ٹٹولتا، بیوی کی پھنکار سنتا، ٹھوکریں کھاتا، تیز چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ گاڑی ہماری توقع کے خلاف بہت جلد وہاں سے چل پڑی۔ ہم جب ان کے پاس سے گزرے تو بڑھیا دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے زمین پہ بیٹھی تھی، اور اندھا دونوں ہاتھوں سے لاٹھی پہ بوجھ ڈالے کبڑا سا ہوا، عجیب بےڈھنگے رخ منھ کیے گم کھڑا تھا۔ اسے کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے؛ قدم آگے بڑھائے یا بس اسی طرح کھڑا رہے، جب تک کہ صورِ اسرافیل نہ بج اٹھے۔

خچّر نے کہا، "میرا خیال تھا گاڑی کچھ دیر یہاں رکے گی اور یہ کہیں بیٹھ جائیں گے۔ بیچارے گاڑی سے رہ گئے۔ آخر انھیں بٹھا لینے میں کیا برج تھا؟ خیر اب کیا ہو سکتا ہے!"

زاغ نے دوسروں کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا، "تو عجیب جذباتی آدمی ہے۔ یوں رحم کھانے لگتے تو اب تک ڈبّا بھیڑوں کا باڑا بن رہا ہوتا اور غلیظ سانسوں کی بدبو سے بھرا ہوتا۔ اگر رش ہو گیا تو مصیبت ہو جائے گی اور ہماری آزادی الگ برباد ہو گی۔"

چوزے نے کہا، "ان دو بڈھوں سے کیا فرق پڑنا تھا؟ ایک کونے میں بیٹھے رہتے۔"

چتر نے کہا، "اب اس بحث سے کیا فائدہ؟ زاغ ! چلو کھیل شروع کریں۔"

فیزنٹ نے نعرہ بلند کیا، "لوگو! پیاس سے دم نکل رہا ہے۔ اگلے اسٹیشن پہ پانی کا چارا کیے بغیر مفر نہیں۔"

چتر نے تجویز دی، "جو پہلا ہاتھ مارے وہ گھڑا بھر کے لائے۔" سب نے بہ آوازِ بلند اس پر صاد کیا۔

زاغ نے کہا، "سوائے میرے!"

"کیوں؟"

اس نے متانت سے عذر پیش کیا، "کیونکہ یہ میرے وقار کے منافی ہے۔"

یہ جواب سن کر بوم، چتر، خچر اور چوزہ حیران سے ہو کر اس کا منھ دیکھنے لگے۔ فیزنٹ اور خرگیسنے کو اس کی بات سمجھ تو آ گئی، مگر شدید رنج ہوا کہ ہمارے ہوتے ہوئے یہ کون ہے جو اس طرح وقار کا دعوا کرے۔

Scanned with CamScanner

چترنے بےتاب ہوتے ہوے کہا، "چلو یار، تاش تو بانٹو۔ خواہ مخواہ میں وقت ضائع ہو رہا ہے۔ ابھی اسٹیشن دور ہے۔ جب پانی لانا ہو گا، دیکھا جائے گا۔"

پہلا ہاتھ بٹا، اور زاغ ہارا۔ کھیل جاری رہا۔ اسٹیشن قریب پہنچا تو کہا گیا، "چل بھئی زاغ، گھڑا سنبھال۔"

وہ انجان بن کے کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔ گاڑی رکتے ہی فیزنٹ پلیٹ فارم سے ایک شیشم کی پتلی شاخ پتّوں سمیت توڑ کر لے آیا۔ اس نے شاخ گھماتے ہوے زاغ سے پوچھا، "جائے گا یا نہیں؟"

"نہیں!"

ایک زنّاٹے کی فیزنٹ نے اس کے ٹخنوں پہ دی۔ زاغ کی رعُونت کے اس علاج پر سبھی خوش تھے۔

"جائے گا؟"

"نہیں!"

کارڈ نے وِسل دی۔ خچّر نے پھرتی سے گھڑا کھینچا اور پانی لینے دوڑ گیا۔ فیزنٹ نے ایک اور کھینچ کر ویسی ہی اس کے ٹخنوں پر دی۔ اس نے ڈانس سا کرتے ہوے چھڑی پکڑ لی۔

فیزنٹ اب جلال میں تھا، "چھڑی فوراً چھوڑ دے، ورنہ ڈوئل کے لیے تیار ہو جا۔ اب کے اصلی ڈوئل ہو گی، اور موت تک! چاقو، چھری، جو چاہو ہتھیار منتخب کر لو۔"

زاغ نے سب کے تیور بدلے ہوے دیکھے تو پہلے خوف زدہ ہوا، پھر جھٹ پینترا بدل کر ہنسنے لگا، "کمال ہے یار، میں مذاق کر رہا تھا۔ تم لوگ خواہ مخواہ سنجیدہ ہو گئے۔"

اتنے میں گاڑی کھسکنے لگی۔ دوڑتے ہوے خچّر نے پہلے گھڑا رکھا، اور پھر ایک جست لگا کے ڈبے کے اندر پہنچا۔ وہ خوب ہنس رہا تھا، "حد ہو گئی یار!"

"کیا ہوا؟"

ننگے پاؤں، جو گرم پلیٹ فارم پر جھلس گئے تھے، وہ سیٹ پر بیٹھ کر گیلے ہاتھوں سے سہلانے لگا۔ "بڑا مزا آیا!"

"ہوا کیا؟"

"ایک بہت خوبصورت اور اسمارٹ لڑکی نے مجھے آواز دے کر بلایا۔ زندگی میں پہلی بار کسی لڑکی نے مجھے آواز دی۔"

"بائیں؟ کیا کہتی تھی؟" حسد سے سب کی آنکھیں پھٹ رہی تھیں۔

"وہ اس گاڑی کی فرسٹ کلاس میں اپنے خاندان کے ساتھ سفر کر رہی ہے۔"

"اُلو کے پٹھے، یہ بتا کہ اس نے تجھے کہا کیا؟"

"کہتی تھی، او سوڈے والے، برف ہو گی؟"

ایک بلند قہقہہ پڑا، اور یوں لگا جیسے ڈبّے سے زاغ کی کمینگی اور دلوں کی کدورت دُھل کے باہر بہہ گئی ہو۔

"لڑکی یقیناً ذہین ہے۔ اس نے تمھیں ٹھیک پہچانا۔ خاکی نیکر، ننگے پاؤں، ننگا بدن، اور وہ بھی ریت مٹی سے اَٹا؛ وہ کوئی ٹھل کی جاہل بڑھیا تھی جو تجھے فوجی سمجھ لیتی؟" چوزے نے اپنی

رائے پیش کی۔ کھیل معطّل تھا، لیکن بساط ابھی سیٹ پر تولیے کی صورت میں بچھی تھی، اور تاش کی گڈی درمیان میں ساکت پڑی تھی۔ کون جیتا اور کون ہارا، اس بارے میں کوئی بات کھل کر سامنے نہیں آ رہی تھی۔ بلند آواز میں بحث زوروں پر تھی۔ جیتنے والوں کی مخصوص عادت کے مطابق زاغ اور خرِعیسےٰ بہت عاجزانہ سی جیت تسلیم کر رہے تھے، اور ہارنے والے قسمیں کھا کھا کر لمبی چوڑی ہار کا اعلان کر رہے تھے۔ بوم نے چوزے سے راز داری سے پوچھا، "کیا بنا؟"

اس نے ناک چڑھا کر کہا، "سب صاف! لگتا ہے اپنے آخری دس بھی ہار گیا ہے۔"

"مر گئے! اب اس حرامزادے کا خرچ کون اٹھائے گا؟ یار، تُو نے تو اسے منع کرنا تھا۔"

"ہارنے والا کب منع ہوتا ہے، اور پھر چتر تم جانتے ہو، وہ جوئے کا ایک دَھتی ہے۔"

چتر ایک کونے میں کھڑا فیزنٹ کو اعتماد میں لے کر بتا رہا تھا، "فلاش، چانس اور اِسکِل کا کھیل ہے۔ تمھیں پتا ہے، اسکِل میں تو مَیں کسی سے کم نہیں ہوں، بلکہ زاغ اور خرِعیسےٰ میرا کیا مقابلہ کریں گے! لیکن سالا پتّا ہی نہیں پڑا۔ پاس پیسہ کھلا ہو تو اس کھیل میں ہارنا ناممکن ہے۔ تم مجھے سو روپے دے دو قرض، پھر دیکھو کیسی دُرگت بناتا ہوں ان کی۔ میرے بینک میں کوئی دو ڈھائی سو روپے پڑے ہیں۔ جس دن واپس پہنچیں گے، اسی دن سب سے پہلے سو روپے نکال کر تمھاری ہتھیلی پر رکھ دوں گا۔ نو پرابلم۔ جوئے میں گنوائی ہوئی رقم صرف جوئے ہی کے ذریعے واپس آ سکتی ہے۔"

"بوم اور چوزے نے بھی پانچ پانچ روپے لگائے تھے، وہ بھی نکل گئے۔ میں اب داؤ ڈبل کرنے کی سوچ رہا ہوں۔ اسی طرح میری بچت ہو سکتی ہے۔"

فیزنٹ نے حیرانی اور افسوس کے ملےجلے احساسات کے تحت کہا، "او تیرا خانہ خراب۔ بوم اور چوزے کو بھی چھلوا دیا تُو نے؟ چل یہ لے دس روپے۔"

"دس روپے سے کیا ہو گا؟ پچاس تو دے!"

"اچھا یہ بیس پکڑ۔"

فیزنٹ نے دس دس کے دو نوٹ گول کر کے اس کی مٹّھی میں تھما دیے۔ بازی پھر جم گئی۔ کھیل، جو ہنسی ہنسی میں ایک آنے سے شروع ہوا تھا، اب چار آنے بورڈ تک پہنچ چکا تھا۔ ماحول میں سنسنی اور تناؤ ایسا شدید تھا کہ ہم اپنی جاگتی آنکھوں سے اسے تیرتا پھرتا دیکھ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم سب ایک کھسکتے ہوے گلیشیر کے سائے میں کھڑے ہوں، جہاں ایک ذرا سی بےاحتیاط آواز اس قیامت خیز حرکت کو وجود میں لا سکتی ہو جہاں ہزاروں مربع میل کے رقبے میں برف کا لڑھکتا ہوا عظیم تودہ مکمل تباہی و بربادی پھیلاتا ہوا پورے لینڈ سکیپ کو تہہ و بالا کر دے گا، پھر اس علاقے میں کوئی درخت، کوئی جانور، کوئی انسان باقی نہ بچے گا، بلکہ سب پس کے برف اور مٹّی بن کے رہ جائیں گے۔ دوسری طرف صورتِ حالات یہ بنی تھی کہ گویا ہر پتّا ہاتھ میں بُھرا پستول لیے چپ ہے کہ موقع ملے تو پتے میں سے نکلے، قدِ آدم کھڑا ہو کر پستول داغے اور واپس پتّے کے پردے میں جا چھپے۔ ہر کھلاڑی جیسے تلوار کی دھار پر چل رہا تھا۔ گنتی کے صرف تین یا چار الفاظ تھے؛ بلائنڈ، چال، شو، جو کھیلنے والوں کے لبوں کے درمیان سے پھسلتے ہوے، گھاس پہ گرتے پتّے کی سی نرمی لیے، کانوں کے پردوں پر گرتے۔ کھیل

Scanned with CamScanner

کے دوران ہونے والی ہلکی پھلکی دل لگی کا اب وہاں کوئی مقام نہ رہ گیا تھا۔ فقرہ کسنے کی نہ تو کسی میں ہمّت تھی اور نہ ہی کسی میں سننے کی تاب۔ تین تماشائی ارد گرد کھڑے تھے، اور جو کچھ کھلاڑیوں کے لیے غیب سے ظہور میں آ رہا تھا اور جو جلد ہی آنے والا تھا، اس کو، اس کی تمام تر ہوقلمونیوں سمیت، دَم سادھے، ایک اشتیاق کے عالم میں دیکھ رہے تھے۔

چتر جھلا کر تماشائیوں سے مخاطب ہوا، "یہ تم لوگ کیا سر پر سوار ہو گئے ہو؟ کوئی اِدھر پتّے دیکھتا ہے، کوئی اُدھر دیکھتا ہے۔ اس طرح ساری گیم ننگی ہو جاتی ہے۔ جاؤ اپنا کام کرو۔ اگر کچھ نہیں سوجھتا تو پرے بیٹھ کر چوزے کے بوسے لو۔ وقت گزاری کا اچھا مشغلہ ہے، میں آزما چکا ہوں۔"

صرف تماشائی ہنسے۔ چوزے نے کہا، "حرامی! بکواس سے باز نہیں آتا!"

خچّر جھنجھلایا، "چترا تو پتّے بانٹ، کیا فضول باتیں کر رہا ہے۔"

فیزنٹ نے سوٹ کیس کھول کر تولیہ نکالا، غسل خانے میں دھول ریت سے بھرا منہ دھویا، بال سنوارے، کپڑوں سے مٹی جھاڑی، اور جیسے ہی گاڑی اسٹیشن پہ رکی تو چوزے سے کہا، "چل ذرا پلیٹ فارم پر ہوا خوری کرتے ہیں۔" اور ڈبے کے فراٹی پین سے پلیٹ فارم کی بھٹّی میں ہوا خوری کے لیے اتر گیا۔ پیچھے ہی چوزہ اترا۔ چتر نے بوم سے کہا، "ابے تُو رہا نہ وہی اُلّو کا اُلّو۔ تجھے کس نے بوم بنا دیا؟ وہ گئے فرسٹ کلاس والی لڑکی تاڑنے، تو یہاں بیٹھا مکھیاں مارتا رہیو۔ چل بھاگ!" بوم بھی ان کے پیچھے نکل گیا۔

گاڑی ذرا تیز ہو چکی تھی کہ وہ تینوں باری باری واپس سوار ہوئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ڈبے کے فرش پر زاغ اور چتر گتھم گتھا ہیں۔ خچّر اور خرعیسےٰ ایک طرف کھڑے بہت تُندوتیز لہجے میں گالیوں کی آزادانہ آمیزش سے، علی الترتیب چتر اور زاغ کے حق میں اپنے اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں دلائل دے رہے تھے۔

"ہوا کیا؟"

زاغ بولا، "ہونا کیا تھا، ویسے تو سالے جیت نہیں سکتے، اندر خانے چتر اور خچر آپس میں مل گئے۔ چلو یہاں تک تو ٹھیک تھا، اب چتر نے ٹانک تلے پتّے چھپا لیے۔ وہاں سے نکال رہا تھا کہ میں نے پکڑ لیا۔ پتا نہیں کب سے یہ بدمعاشی چل رہی تھی۔"

چتر بولا، "جھوٹ بولتا ہے! موٹا پول تھا، بیس روپے کے قریب، پتّا اس کے پاس تھا نہیں، بلف مار رہا تھا۔ جب دیکھا کہ مَیں اسے چھوڑنے والا نہیں تو روند مچا دیا۔ بہانہ گھڑ لیا کہ پتے چھپائے ہوئے ہیں۔ کیوں خچّر؟"

"چتر ٹھیک کہہ رہا ہے۔"

فیزنٹ نے پوچھا، "پول کی رقم کس کے پاس ہے؟"

خرعیسےٰ نے کہا، "میرے پاس ہے۔"

"نکالو، اب جھگڑا ختم - چوزے، اسے چار برابر حصوں میں تقسیم کر کے ایک ایک حصہ سب کو دے دو۔ آؤ کھانا شروع کریں۔"

پوٹلیاں کھلیں، ڈبے نکلے۔ تمام کھڑکیاں گرا دی گئیں۔ اس سے آنے والی ریت میں کچھ فرق ہوا

اور پُرسکون سا اندھیرا بھی پھیلا، لیکن چند لقمے کھائے ہوں گے کہ سب پسینے میں شرابور ہو گئے اور دم گھٹنے لگا۔ مجبوراً دونوں دروازوں کی کھڑکیاں کھولنی پڑیں۔ بےرحم دھوپ میں ریت، بیروں کی کنیوں کے ذخیروں کی طرح پڑی چمک رہی تھی اور جلتی ہوئی روشنی کا عکس ہماری آنکھوں میں پھینک رہی تھی۔ اگر کوئی لمحے بھر کے لیے پوری آنکھ کھول کر دیکھ لیتا تو کچھ وقفے کے لیے اندھا ہو جاتا۔

بوم نے کہا، "یار خچر، تیری دریافت خوب ہے۔"

"دیکھا تم لوگوں نے؟"

بوم بتانے لگا، "دیکھ تو نہیں سکے۔ ڈبے کی کھڑکیاں بند تھیں، اور دروازے کی کھڑکی کھلی تھی لیکن وہ اس سے ہٹ کر بیٹھی ہے۔ باہر اتنی تیز روشنی تھی تو اندر اندھیرے کمرے میں کیا خاک دکھائی پڑتا۔ ایک آٹھ نو سال کا لڑکا دروازے پر آ کر کھڑا ہوا تھا۔ اتنا خوبصورت کہ میں اور چوزہ فوراً اس کی بہن پر نادیدہ عاشق ہو گئے۔ فیزنٹ کا اصرار ہے کہ وہ باقاعدہ اعلانِ عشق کرنے سے پہلے لڑکی کو بنفسِ نفیس دیکھے گا۔ شام کو لڑکی دیکھنے کے بعد فیصلہ کرے گا کہ اسے بھی عاشق ہونا ہے یا نہیں۔"

غالباً سوچ کا یہی وہ انداز تھا جس سے ڈرتے ہوئے اس شہر میں ہم جیسے بےتکلف دوست بھی ایک دوسرے کی بہنوں کی تعداد، ناموں اور عمروں سے ناواقف رہتے، اگرچہ بھائیوں کے بارے میں ایسے کوائف کا تبادلہ ایک معمولی بات تھی۔ لوگ اس سوچ کے ننگپن سے گھبرا کے گھر کی عورتوں کے وجود میں ہونے کی خبر، کتنی ہی مبہم کیوں نہ ہو، کسی تک پہنچنا غیرت و حمیّت کے خلاف جانتے تھے۔ سوچ کا یہ انداز درمیانے اور اوپر کے طبقوں کے لیے مخصوص تھا۔ غریب اس کے حق دار نہ تھے، بلکہ ان سے مطالبہ اس کے بالکل برعکس کیا جاتا تھا۔ ایک گرمیوں کی شام فیزنٹ کے مردان خانے کے لان میں اتفاقاً بوم اور چتر بھی موجود تھے۔ بیس برس کا ایک تازہ رُو دیہاتی فیزنٹ نے نیا نیا ملازم رکھا تھا۔ وہ ان پڑھ سا جوان کرسیاں میز لگانے اور مہمانوں کی خدمت میں اپنی سی سعی کر رہا تھا۔ معلوم ہو رہا تھا کہ ابھی وہ آدابِ غلامی سے بخوبی واقف نہ ہوا تھا۔ وہ لگن اور تن دہی سے اپنا فرض جاننے اور نبھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ فیزنٹ نے اسے بلایا اور کہا، "اوئے، رات کو اپنی بیوی کو میرے کمرے میں لے آنا۔" بوم اور چتر سنّاٹے میں آ گئے۔ نیا نیا روزگار ملنے پر خوش خوش چہرہ ایک دم بجھ کے ذرا سا نکل آیا، اور وہ کھڑا ننگے پاؤں کے انگوٹھے سے مٹّی اکھاڑتا رہا اور زمین کو گھورتا رہا کہ شاید پھٹ جائے اور سمانے کی جگہ دے دے۔ فیزنٹ نے پھر کہا، "اوئے سنا؟ چل جا ابے!" دو وقت کی روٹی کی مجبوری نے، اور مالک کے روح کھینچ لینے والے تقاضے نے، جس طرح اسے اندر باہر سے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا، اس کی پوری داستان اس لوٹ کے جاتے شخص کے جھکے کندھوں پر تفصیل سے رقم تھی۔ بوم اور چتر کے کانوں میں درختوں پر بسیرا کرتی شور مچاتی چڑیوں کی چہچہاہٹ سیلاب کی طرح کانوں میں گھسی جا رہی تھی اور ذہن پتھر تھے۔ کچھ نہ سوجھا۔ بس چند رسمی باتیں کر کے اٹھ گئے۔ فیزنٹ نے روکا بھی، مگر وہ بہانہ کر کے نکل گئے۔ چتر سے کہانی کا انجام جانے بغیر صبر ممکن نہ تھا۔ ایک آدھ دن بعد پوچھ ہی لیا، "اس رات پھر وہ بیوی کو لایا؟"

Scanned with CamScanner

"نہ، بُجھ گیا، بہن۔"

خجّر نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا، "اس پر عاشق ہونے کا حق اگر کسی کو ہے تو وہ میں ہوں، لیکن افسوس کہ مجھے دست بردار ہونا پڑ رہا ہے، کیونکہ وہ مجھے سوڈا برف والا سمجھتی ہے۔" پھر اس نے وینڈرز کے لب و لہجے میں لیمن، سوڈا برف، کی آواز لگا کے دکھائی۔

کچھ دیر تک تو یہ عاشقی کے دعوےدار اپنی اپنی فوقیت کا راگ الاپتے رہے، پھر گرمی کی شدّت اور کھانے کی غنودگی نے آن دبوچا۔ باتیں ختم ہو گئیں، اور سب الٹے سیدھے، جہاں جس کو جگہ ملی، سیٹوں اور برتھوں پر بےسُدھ گر گئے۔ جب نیند اکھڑی تو گاڑی چل رہی تھی، اور گرمی کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ کھڑکیاں کھولی گئیں۔ فرش پر دھول اور ریت کی تہہ جم چکی تھی۔ جس جس برتھ اور سیٹ پر کوئی سویا تھا، اس پہ مٹی کی تہہ کے درمیان اس کے بدن کا نقشہ سا ابھر آیا تھا۔ سر کے بال، بھنویں، پلکیں اور جلد، سب مٹی کا رنگ لیے یک رنگ ہو چکے تھے۔ باہر ریت کے ٹیلوں پر اونٹوں کی ایک لمبی قطار تیز تیز قدموں سے، ٹرین کو پشت دیے، دور ہوتی چلی جا رہی تھی؛ ان پر خالی کجاوے دھرے تھے۔ وہ بوجھ کہیں اتار کر اب اغلباً اپنے گھروں کی جانب رواں تھے۔ ڈھلتے سنہرے سورج میں ان کے سائے لمبے ہو گئے تھے۔ اتنے بہت سے اونٹوں کے لیے دو اونٹ بان تھے، اور وہ اونٹوں پر سوار، اونٹ کی چال کی دُھن میں ہچکولے کھا رہے تھے۔ ان میں سے ایک کان پر ہاتھ رکھے تان لگا رہا تھا، جس کی آواز گاڑی کے شور میں دب کر ہم تک پہنچ نہیں پا رہی تھی۔ لیکن ہم ان سانولے، تنگے بدن والے، صحرا کے پالوں کے گیتوں سے واقف تھے۔ شہر میں زمینداروں کے ڈیروں پر گندم، بھُوسا، ایندھن پہنچا کر خالی اونٹ لے کر شہر سے نکلتے اور اپنے گاؤں کی راہ پہ پڑتے تو شہر کی گھٹن اور نامانوس ماحول اور مالکوں کے کارندوں کے تضحیک آمیز سلوک کا احساس مٹتے ہی، برہا کی پیڑا میں رَچے فرید کے گیت، جدائی کے شعلوں کی سی لپک رکھنے والی راگنی، ملتانی کافی، میں ان کے سینے سے ابھر کر دور دور تک اداسی پھیلاتے بکھر جاتی۔ ان گیتوں میں کھلی چاندنی میں صحرا کی لہر پر آسودہ، ریت کے لامتناہی سلسلے جیسے اکلاپے کا دکھ چھپا ہوتا، محبوب کے سینے سے لگ کے اس میں جذب ہو جانے کی تڑپ مضمر ہوتی، اندر ہی اندر کھا جانے والی تمنّا کا سوز چھپائے نہ چھپ رہا ہوتا۔ خاموش ستارے، پیلا ششدر چاند، خالی سڑک اور گھنٹیوں کی حزیں سی ٹن ٹن، سبھی دکھ کے ایک رشتے میں بندھے، اس گیت میں بہتے چلے جا رہے ہوتے۔ یہ ہجر کے دکھ کا گیت کسی ایک شخص کا دکھ نہیں، بلکہ کائنات کا دکھ بیان کر رہا ہوتا، جس کا ذرّہ ذرّہ مجبور ہے، اور اس انتظار میں ہے کہ کُن کا حکم کہیں ٹھہرے تو وہ ٹوٹے اور حکم دینے والے میں ضم ہو کر مکتی پا جائے۔ ہمارے وہی نغمے سب سے شیریں ہوتے ہیں جو گہرے دکھ کی بات سناتے ہیں۔

فیزنٹ کہنے لگا، "یار! کسی طرح چائے کا انتظام ہونا چاہیے۔"

چتر نے فوراً اس کی تائید کی۔ باقیوں نے ایک ایک گلاس پانی چڑھایا اور مطمئن ہو گئے، کیونکہ ان کے گھروں میں ابھی چائے کا کوئی ایسا رواج نہ چلا تھا۔ شام کو صاحبِ حیثیت گھرانوں میں باداموں کی ٹھنڈائی پی جاتی۔ شائقین اس میں دو چار سبز پتّے بھنگ کے بھی ڈال لیتے۔ فیزنٹ نے خودکلامی کے انداز میں کہا، "اگلے اسٹیشن پر چائے کا ضرور انتظام ہو گا۔ یہ

علاقہ ایسا بھی گیا گزرا نہیں ہو گا۔"

چتر ہنستے ہوئے بولا، "فیزنٹ! تمھیں چائے پلا دیں گے، یہ کون سی ایسی مشکل بات ہے۔ اسٹیشن پہ انتظام نہ بھی ہوا تو میں سالے اسٹیشن ماسٹر کے گھر سے بنوا لاؤں گا۔ تم بس اتنا کرنا کہ جب گاڑی چلنے لگے تو زنجیر کھینچ دینا۔ آدھ گھنٹا تو اسی میں نکل جائے گا۔"

زاغ بولا، "اور پچاس روپے تیرا باپ دے گا؟" چتر کی اس تجویز پر دوسرے بھی گھبرائے کیونکہ وہ ایسا کر گزرنے والا آدمی تھا۔

"سائیں گھبراتے کیوں ہو؟ فیزنٹ دے گا۔ امیر آدمی ہے، اور پھر شوق بھی تو پورا کرنا ہے۔ اس کے سامنے پچاس روپے کی کیا حیثیت ہے؟ میرے پاس اگر ہوتے تو میں پہلے گارڈ کی ہتھیلی پر پچاس روپے رکھتا، پھر پلیٹ فارم سے باہر نکلتا۔"

فیزنٹ بولا، "خیر! چائے کی کوئی ایسی بھی خاص طلب نہیں۔ سنو! گاڑی بڑے اسٹیشن تک، جو جنکشن بھی ہے، رات آٹھ بجے تک پہنچے گی۔ وہاں چائے سوڈا وغیرہ مل جائیں گے، لیکن کھانا اچھا نہیں ملے گا۔ سوکھی روٹیاں، باسی دال اور بھینس کے گوشت کے کباب، جو کم ازکم تین دن پرانے ہوں گے۔ اگر تم سب مانو تو اگلے اسٹیشن پر گارڈ کو کہہ کر تار دلوایا جا سکتا ہے کہ سات آدمیوں کے لیے جنکشن اسٹیشن پر ڈنر تیار ہو۔ پلاؤ، قورمہ، فیرنی، سب کچھ ہو گا۔ ایک آدمی کا خرچہ بس یہی کوئی تین چار روپے تک آئے گا۔"

زاغ اور خرعیسے کو اس تجویز کے قبول کرنے میں بھلا کیا چیز مانع ہو سکتی تھی۔ انھوں نے جھٹ اپنی رضامندی کا اعلان کر دیا۔ چتر نے پہلے تو بغلیں جھانکیں، پھر خجّر اور چوزے کے ساتھ اس نے بھی نفی میں سر ہلا دیا، اور کہا، "ہم تو بھینس کے کباب ہی کھائیں گے کیونکہ ہم چاروں کو، جب موسم ایسا ہو جیسا کہ آج ہے، تو بھینس کے کباب ہی مزا دیتے ہیں۔"

فیزنٹ نے کہا، "چلو چوزے کے پیسے میں دے دوں گا۔ تم تینوں تین تین روپے کے لیے کیوں مرتے ہو؟"

چوزہ نے "نو تھینک یو" کہتے ہوئے اس کی خصوصی پیشکش رد کر دی، اور اکثریت کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ چتر بولا، "او سائیں! بات تین تین روپے کی نہیں؛ کہو تو تین تین سو لٹا دیں، لیکن شرط صرف بیس بیس روپے ساتھ لانے کی تھی۔ تم لوگوں نے فاوٌل پلے کیا اور زیادہ پیسے ساتھ لے آئے۔ ہمارے پاس معاہدے کے مطابق صرف بیس بیس روپے ہی ہیں، اور ظاہر ہے کہ اس رقم میں یہ اللّے تللّے نہیں ہو سکتے۔"

ٹھوس مالی حقائق نے یوں غیرمتوقع طور پر اپنا چہرہ کیا ننگا کیا کہ سبھی کو خوابوں کی دنیا سے کھینچ کر سخت زمین پہ لا پٹخا۔ ماحول پہ افسردگی اور اس کے ساتھ شرمندگی نے پھیل کر محفل پہ خاموشی طاری کر دی۔ وہ ایک عجیب طرح کی بےسکون اور تکلیف دہ خاموشی تھی۔ اب کہیں کہیں ریت کے ٹیلوں میں اکّادکّا درخت سر نکال کے جھانکنے لگے۔ اس اداس شام میں اور بھی اداس مَیلے مَیلے گیت پھیلنے لگے۔ دور ایک کچّا سا کوٹھا کھڑا تھا۔ گاڑی کی رفتار کم ہونے لگی۔ بریکیں لگنے سے چوں چاں کا ایک شور بلند ہوا، پھر دھڑام دھڑام سے کوئی لوہے کی بھاری بھرکم چیز ڈبّے سے ٹکرائی۔ ہم نے گھبرا کے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد و

آواز بند ہو گئی۔

چتر بولا، "اس پوری گاڑی میں صرف ایک حسینہ کا موجود ہونا بیان ہوا ہے۔ اٹھو! سب چل کے اس کی زیارت کریں۔"

خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ سب کپڑے جھاڑتے اٹھ کھڑے ہوے۔

بوم بولا، "حضرات! جان لو، حسین چہرے کی زیارت ہے، کسی مزار کی نہیں۔ کوئی بھول کر بھی دعا کے لیے ہاتھ نہ اٹھائے، ورنہ مصیبت بن جائے گی۔"

خرِعیسے بولا، "یار، تُو ہمارے ساتھ یہ شاعروں والی باتیں نہ کیا کر۔"

خچّر اپنے پر سے برف والے کا لیبل اتارنے کے لیے جلدی جلدی پتلون قمیض پہن رہا تھا۔

زاغ چوزے کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوے کہنے لگا، "بوم! ہم سمجھتے ہیں حسن کا کیا مقام ہے۔ کوئی اپنے اس چوزے سے بڑھ کر کیا حسین ہو گا۔"

فیزنٹ چہچہایا، "زاغ کے بچّے، تو چوزے سے زیادہ ہی آزادی لینے کی کوشش کر رہا ہے۔ چل ہٹا ہاتھ۔ چوزے، تو بھی سن لے! ملنا جلنا رقیباں دا بند کر دے، نہیں تے مخملی ڈھڈ تیڈا پھاڑ دیساں۔" چوزہ کمر بچا کر زاغ کے بازو سے باہر تھا۔

اس گاڑی کے اکلوتے فرسٹ کلاس ڈبے کے دروازے میں چودہ پندرہ سال کی ،جوان ہوتی ہوئی، گندمی رنگت کی، بہت اوسط شکل و صورت کی مگر باسلیقہ لڑکی معصوم آنکھوں سے پلیٹ فارم کا جائزہ لے رہی تھی۔ کھڑکی میں بازو ٹِکائے، سیٹ پر گھٹنوں کے بل نیم ایستادہ، ویسے ہی چہرے مہرے کا اس کا چھوٹا بھائی باہر دیکھ رہا تھا۔ لڑکی نے جب سات چہروں پہ جڑی چودہ آنکھیں اپنے بدن کو بری طرح ٹٹولتی پائیں تو خوف سے اس کا چہرہ اتر گیا۔ سہم کر سر پہ دوپٹہ لیتے ہوے وہ اپنی ماں کے پہلو میں پلیٹ فارم کی طرف کمر کر کے ہماری بےرحم نظروں سے پناہ کی جُویا ہوئی، اور ہم ویسے ہی ڈھیٹ بنے کھڑے رہے۔ اس سات آٹھ سالہ لڑکے کے چہرے پر شدید غصّے اور رنج کے آثار واضح تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسے اس‌بات کا شدت سے احساس اور قلق ہے کہ یہ سات شخص مل کر ان کے ساتھ کوئی زیادتی کر رہے ہیں، اور یہ جرأت انھیں اس لیے ہو سکی کہ کوئی بالغ مرد ان کے ہمراہ نہ تھا۔ وہ دل میں پیچ و تاب کھاتے ہوے، ہم پہ کڑی نظر رکھے ہوے تھا، لیکن منھ سے کچھ نہ بول سکا۔ گھومتے پنکھے کے نیچے پسینے اور گرمی سے بےحال، سیٹ پر ٹانگیں پسار کر بیٹھی اس کی موٹی سی ماں نے ڈانٹا، "تم وہاں کیا دیکھ رہے ہو؟ ادھر آؤ!" اس کی آواز سے خوف مترشّح تھا۔ وہ تھکے قدموں سے چلتا ہوا، جا کر ماں کے گلے میں بازو ڈال کر اس کی چھاتی میں منھ چھپا کر کھڑا ہو گیا۔ لڑکے کے بدن کی لرزش سے اندازہ ہو سکتا تھا کہ وہ رو رہا تھا۔ ماں نے اس کی کمر پر ہاتھ پھیرا، اور اٹھ کے کھڑکیاں بند کرتے ہوے کہا، "میں ابھی گارڈ کو بلاتی ہوں۔" ہم کھسیانے ہو کر واپس ڈبے کی طرف بھاگے۔ گاڑی چل پڑی اور چلتی رہی، لیکن ہم میں سے کسی کو بہت دیر تک منھ کھولنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہوا۔ سات لڑکے، جن میں سے ہر ایک بزعمِ خویش یوسفِ ثانی بنا، عشق و محبت کے جذبات سے چھلکتا دل لیے، ہدیۂ عقیدت پیش کرنے کے لیے آگے بڑھا، لیکن آئینے میں یوسفِ ثانی کی بجائے ایک خوفناک درندے کی شکل دیکھ کر واپس

پلٹا۔ ہم تو صرف توجہ چاہتے تھے، محض اپنے زندہ ہونے کا شعور حاصل کرنے کے لیے۔ ہم شاید اپنی طلب کی رَو میں ایسا رویہ اختیار کر گئے کہ دوسروں کو محبت کی التجا میں بھی بہیمانہ اور ظالمانہ فعل نظر آیا، اور اتنا کہ وہ خوف و ہراس کے دریا میں ڈوب کر رہ گئے۔ خواہشات کے گھوڑے جب بےقابو ہو کر، دانتوں تلے لگام دبا کر، لگام کی بندش سے اپنے آپ کو آزاد کر لیں، تو دیکھنے والے جو کچھ دیکھتے ہیں وہ کرنے والوں کی آنکھوں کو نظر نہیں آتا۔ گنواروں کی ہنسی میں چڑیاں اسی طرح مر جایا کرتی ہیں۔

خچّر نے خاموشی توڑی، "میں اگر اپنی اسی خاکی نیکر میں چلا جاتا تو وہ مجھ سے ضرور بات کرتی، چاہے وہ برف کی فرمائش ہی کیوں نہ ہوتی۔"

بوم بولا، "جب سات بھوکے جنگلی کتّے، منھ کھول کے، لعاب سے لتھڑی زبانیں لٹکا کر ایک بھیڑ کے بچے کے آگے کھڑے ہو جائیں گے تو یہی ہوگا جو ہوا۔"

زاغ نے جواب دیا، "سات بھوکے کتّوں کو بھی تو گوشت چاہیے، اور وہ بھیڑ کے بچے کے پاس ہے، تب کیا کیا جائے؟"

چوزہ بولا، "بوم نے بات ان انسانوں کے بارے میں کی ہے جو کتّوں کا روپ دھار لیں۔ نہ ہم کتّے ہیں اور نہ وہ بھیڑ کا بچّہ۔ قصّہ تو صرف اس روئیے اور انداز کا ہے جو دل موہنے کی بجائے پتا نہیں کیسے خوف ناک صورت اختیار کر گیا۔"

فیزنٹ نے کہا، "ہم نے واقعی انھیں بلا وجہ ڈرا دیا۔ بہت برا کیا۔ سنسان بےآباد علاقہ، اکیلی عورتیں، سات مشٹنڈے؛ وہ ڈرتیں نہ تو اور کیا کرتیں؟"

خرِعیسے نے کہا، "چھوڑو یار اس قصّے کو، جو ہونا تھا ہو گیا، اب کوئی اور بات کرو۔ میری نصیحت تو یہی ہے کہ بس کِرائے کی عورت منگواؤ اور صبح اسے چلتا کرو۔ نہ کوئی بک بک نہ جھک جھک۔"

چتر بولا، "تم لوگوں نے مجھے بہت مایوس کیا ہے۔ سب کے سب بالکل اناڑی ہو، اور لونڈیا پھنسانے کی اے بی سی بھی نہیں جانتے۔ یوں بھی کبھی کوئی لڑکی پھنستی ہے؟ پہلے بھائی، اس کے دل میں ہمدردی پیدا کرو، پھر اس کا قُرب حاصل کرو، پھر اس کی خدمت کرو، پھر اس کی عقل، ذہانت اور سب سے بڑھ کر اس کے حُسن کی تعریف کرو۔ یوں وہ آہستہ آہستہ تمھاری طرف مائل ہو گی۔ پھر جدائی میں جو تم پر صدمے گزرتے ہیں، ان کی لمبی لمبی داستانیں، میرا مطلب ہے فرضی داستانیں، سناؤ۔ اگر قسمت اچھی ہو تو وہ پھنستی ہے۔ اس طرح سے اگر لڑکیاں پھنسنے لگیں تو سارا جھگڑا ہی نہ مٹ جائے۔ میں بھی تم لوگوں کا جوش و جذبہ دیکھ کر خواہ مخواہ بھڑّے میں آ گیا۔ اب اگر اس لڑکی سے کبھی ملاقات ہو بھی گئی تو وہ مجھ سے کہاں پھنسے گی۔"

زاغ چمکا، "یہ بگلا پکڑنے کی ترکیب آپ سنبھال کے اپنے پاس رکھیں، اور یہ بھی آپ کا خام خیال ہے کہ پھر کبھی آپ اس سے مل پائیں گے، اور بدقسمتی سے اگر مل بھی گئے تو حضور کی صورتِ پُرنور کیا اسے یاد رہے گی؟"

اسٹیشن آتے رہے؛ گاڑی رکتی رہی اور چلتی رہی؛ لیکن کسی کو یہ جرأت نہ ہو سکی کہ کسی اسٹیشن پر اتر کر اس ڈبے کی طرف منھ کر سکے۔

Scanned with CamScanner

جنکشن اسٹیشن آ گیا۔ درمیانی سی رونق تھی۔ ہم کباب روٹی کے لیے لپکے۔ کباب لے کر واپس پلٹ رہے تھے تو وہی خاندان ایک متوسّط عمر کے آدمی کے ساتھ، جو رات میں بھی سولا ہیٹ پہنے تھا اور طور اطوار سے بڑا سرکاری افسر دکھائی دیتا تھا، دو تین نوکروں کے سروں پر سامان لدوائے گیٹ سے باہر نکل رہا تھا۔ لڑکے نے اس کی انکلی تھامی ہوئی تھی اور نہایت خوش اور پُراعتماد نظر آ رہا تھا۔ وہ چہرہ اٹھا اٹھا کر اس آدمی کے ساتھ باتیں کرتا، اچھلتا کودتا جا رہا تھا۔ ہم میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی جگہ سوچا کہ اگر ہماری کارگزاری کی شکایت یہ لوگ اس سے لگا دیں تو ہمارا کیا حشر ہو۔ ہم منہ چھپاتے اپنے ڈبے کی طرف کھسک لیے۔ ڈبے کے سامنے تین چار نیلی وردیوں والے ہاتھوں میں ہتھوڑے اور بڑے بڑے پیچ کس سنبھالے کھڑے تھے۔ایک نے ڈبے کے اندر اشارہ کرتے ہوئے پوچھا، "بابو جی! یہ سامان آپ کا ہے؟"

"ہاں۔"

"اسے فوراً باہر نکال لیں۔"

"مگر کیوں؟"

"اس بوگی کی بریکیں خراب ہو گئی ہیں۔ یہ آگے نہیں جا سکتی۔ یہیں کٹ جائے گی۔"

"تو نئی بوگی کہاں ہے؟"

"نئی بوگی نہیں ہے۔ سامان اٹھائیں اور اگر سفر کرنا ہے تو گاڑی کے کسی اور ڈبے میں جائیں۔"

خدایا اب کیا ہو گا؟ گاڑی تو صبح منزل پر پہنچے گی۔ دن تو خیر اچھا کٹ گیا، اب یہ پہاڑ سی رات اتنے رش اور گرمی میں کیسے کاٹیں گے؟

"او بابو جی، سوچنا پھر، پہلے جلدی سے سامان باہر نکالیں۔ ہمیں بوگی کاٹنا ہے۔ انجن آیا کھڑا ہے۔ گاڑی لیٹ ہو رہی ہے۔"

واقعی کالا انجن ڈبے کے ساتھ لگا شوں شاں کرتا، چنگاریاں اڑاتا، ہمارا دشمن بنا، اپنی پوری آب و تاب میں کھڑا ہمیں دھمکا رہا تھا۔ اس قوی ہیکل دشمن سے ہم کیسے نپٹ سکتے تھے؟

زاغ نے اپنا بستر اور سوٹ کیس جھٹ سے نکالا، اور یوں سب سے الگ ہو کے کھڑا ہو گیا جیسے ہمارے ساتھ نہ ہو۔

"بھائی یہاں کوئی قلی مل جائے گا؟"

ایک نیلی وردی والے نے نہایت روکھے انداز میں کہا، "یہاں کوئی قلی ولی نہیں ہوتا۔ جلدی کرو اور سامان نکالو۔"

سب نے جھٹ پٹ اپنا اپنا سامان نکالا۔ اب مشترکہ سامان کی باری تھی۔ کوئی اس پر ہاتھ نہیں ڈال رہا تھا۔ فیزنٹ نے چھڑی لہراتی اور زاغ سے کہا، "چل بھئی تو بھی سامان اٹھانے میں ہاتھ بٹا۔" اس وقت چھڑی لہرانا بےکار تھا۔ اس نے سنی اَن سنی کر دی، اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔ خچّر نے اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر مشترکہ سامان پر ہاتھ ڈالا تو شرما شرمی باقی بھی شامل ہو گئے، مگر زاغ ویسے ہی لاتعلق بنا کھڑا رہا۔ اس کے اس خودغرضانہ رویے سے سب کے دلوں میں اس کے لیے سوائے حقارت اور نفرت کے اور کچھ باقی نہ بچا۔ انجن ہمارے عیش و آرام کے

سامان اس ڈبے کو، جسے ہم اب تک پتا نہیں کیوں اپنا حق اور مقدّر سمجھ چکے تھے، ہماری حسرت بھری نظروں کے سامنے آہستہ آہستہ کھینچتا، پیچھے کی طرف دُور لے جا رہا تھا۔ گارڈ نے سیٹی بجائی۔ ہم اتنے بہت سے سامان کو اٹھائے، گرتے پڑتے، اگلے ڈبے میں مسافروں کی زبانی اور جسمانی مزاحمت کے باوجود طاقت کا استعمال کرتے ہوئے، گھسنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہمیں پتا تھا کہ اگر وہاں نہ گھس پائے تو گاڑی سے رہ جائیں گے۔

اس لمبے سے ڈبّے میں ایک مدّھم بلب جل رہا تھا۔ سب سیٹیں پُر تھیں۔ برتھوں پر گٹھڑیاں وغیرہ لدی تھیں۔ جہاں جگہ ذرا خالی تھی، وہاں کوئی بچّہ سکڑا ہوا سو رہا تھا۔ روشنی ناکافی تھی، اور ڈبے میں گرمی اور رش بھی حد درجے کا تھا، مگر یہ دونوں چیزیں ٹھسائھس بھرے مسافروں میں سے کسی کے لیے بےآرامی یا الجھن کا سبب نہ تھیں۔ ڈھیلے ڈھالے بڑے پکڑوں اور بھاری بھرکم تہمدوں والے مسافر آپس میں خوب ہنس بول رہے تھے - جو خاموش تھے وہ بھی اس نہایت تکلیف دہ ماحول میں سکون سے سفر کا لطف اٹھا رہے تھے۔ بگلے کی ٹانگ جیسی پتلی، سیدھی اور لمبی اور ننھی سی چلم والا سوئی حقہ، دو تین جگہوں پر چل رہا تھا۔ پینے والا چلم میں بھرے خشک پتّی کے تمباکو کو پائپ کی طرح ماچس سے جلا کر ایک لمبا کش کھینچتا، اور کچھ دیر اس کو روک کر دھویں کا ایک پورا بادل ناک اور منہ سے خارج کرتے ہوئے، حقّہ ساتھی کے سامنے کھسکا دیتا۔ زیادہ مہذّب لوگ نسوار کلّے میں دبا لیتے، یا نچلے ہونٹ اور مسوڑھے کے درمیان چٹکی میں بھر کر، چہرہ موڑ کر، کچھ اس تکلیف بھرے انداز میں رکھتے، جیسے جانور کو نمک دیا جا رہا ہو۔ وہ وقفے وقفے سے تھوک کی پچکاریاں ڈبے کے فرش پر یا کھڑکی میں سے ڈبے کے باہر، غرض جدھر ان کا منہ ہوتا، بےتکلّفی سے مارتے جاتے۔ ہم سب کھڑے تھے، کسی لایعنی سوچ میں غرق۔ ابھی کسی کو فرش پر یا سامان پر بیٹھنے کا حوصلہ نہ ہوا تھا۔

خچّر نے پوچھا، "زاغ کہاں ہے؟"

چتر بولا، "ہو گا یار کسی ڈبّے میں۔"

خرِعیسےٰ نے کہا، "اب گاڑی کہیں رکے تو اسے تلاش کریں۔"

چتر بولا، "چھوڑو، صبح دیکھیں گے۔"

فیزنٹ نے چوزے کے کان میں کہا، "تو ادھر ذرا اندھیرے میں چھپ کر بیٹھ۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ کچھ مسافروں کی نظریں بہت غلط ہیں۔ یہ علاقہ اس طرح کی وارداتوں کے لیے بہت بدنام ہے۔"

چوزہ بولا، "میں نے بھانپ لیا ہے۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔"

فیزنٹ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، "تُو ڈر نہیں، اللہ فضل کرے گا۔ ہم اتنے بہت سے ساتھی ہیں، تو فکر نہ کر۔ ہمیں کوئی پہلے مارے گا تو تم تک پہنچے گا۔ تم ان عورتوں کی طرح اکیلے تو نہیں۔"

ہمیں پرانا ڈبا یاد آ رہا تھا، جو ہمارے لیے اک ذرا سی دیر میں عیشِ رفتہ کی یاد بن کے رہ گیا تھا۔ ہم فرش اور سامان پر بیٹھ گئے۔ تین چار اسٹیشن گزرے اور چند سواریوں کے اترنے سے

Scanned with CamScanner

کچھ جگہ بنی، تو ہم نے بہ اصرار فیزنٹ اور خرگوش کو، جو دوسروں سے زیادہ پُرآسائش زندگی کے عادی تھے، وہاں بٹھا دیا۔ خرگوش نے کہا، "اب تو زاغ کو بھی یہیں لے آئیں۔ وہ پتا نہیں اکیلا کہاں خراب ہو رہا ہو گا۔"

ایک اسٹیشن پر گاڑی رکی تو چتر یہ کہتے ہوئے نیچے اتر گیا کہ "ابھی آتا ہوں۔"

واپس آیا تو بتایا کہ "میرا شک درست تھا۔ زاغ میرے مال پر سیکنڈ کلاس کی برتھ پر بستر جمائے، پنکھے کے نیچے پڑا سو رہا ہے۔ میں نے پوچھا، یہ کیا؟ تو کہنے لگا، ساری رات کی بےآرامی کون برداشت کرے۔"

خرگوش کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ فیزنٹ نے کہا، "میں جانتا ہوں وہ بڑا چھوٹا اور کمینہ آدمی ہے۔ آج سے تین چار سال پہلے تک یار لوگوں کے نزدیک اس کی قیمت ایک جوڑا کبوتر ہوا کرتی تھی، اور قادو خان پہلوان کے نیم بدمعاش سے شاگرد اسے لیے پھرا کرتے تھے۔ وہ یوں ساتھ نہ چھوڑتا تو اور کون چھوڑتا۔"

قادو خان پہلوان بھی اپنی ذات میں ایک مکتبِ فکر تھا۔ جوانی میں بہت شہ زور اور نامور پہلوان رہا تھا۔ پھر عیاشی میں پڑ گیا، اور لاکھوں کی جائیداد چند سالوں کے اندر اندر بیچ باچ کر یوں صاف کر دی کہ کفن کے لیے کوڑی نہ بچا کے رکھی۔ اس کے بعد بدمعاشی پر اتر آیا۔ آخر وہ زمانہ بھی ختم ہوا۔ آج کل ایک چھوٹے سے دکان نما کمرے کے سامنے سڑک کے کنارے بازار میں چارپائی ڈالے بیٹھا رہتا تھا۔ کمر میں ملتانی لنگی، اوپر کا دھڑ اوّل تو ننگا، اور بہت ہوا تو ململ کا کرتا سامنے ڈالے ہوتا کہ کرتے کے دونوں بازو کندھوں پر سے گزر کر پیچھے ننگی پشت پر لٹک رہے ہوتے، اور کرتے سے چوڑی سرخ و سفید چھاتی اور ڈھل ڈھل کرتا پیٹ ڈھنپا ہوتا، ڈھنپا کیا ہوتا، بس ڈھانپنے کی ایک ناکام کوشش ہوتی۔ ایک ہاتھ میں کھجور کا پنکھا، دوسرے میں بٹیر، اور سامنے حقّہ دھرا رہتا۔ کمرے کے اندر ایک لمبا بانس فرش کے متوازی چھت سے لٹکایا ہوا تھا، جس پہ بٹیروں کے بیسیوں پنجرے لٹکے نظر آتے۔ بازار میں وہ کمرہ پہلوان نے کبھی شاید دکان کرنے کے لیے کرائے پر لیا تھا، مگر اب اس میں کوئی سامان دکان میں رکھ کے بیچنے کا تو نہیں تھا، البتّہ پہلوان کے ناکام منصوبے کے آثار کے طور پر چند زنگ آلود کنستر اور کچھ ٹوٹے پھوٹے ڈبے وہاں پڑے تھے۔ ایک زمانے سے دکان ہر لحاظ سے پہلوان کی بیٹھک بن کے رہ گئی تھی، جہاں ہفتے عشرے میں بٹیر بازوں کا ہجوم اکٹھا ہوتا، بٹیروں کی لڑائی کا اکھاڑہ جمتا، اور لمبی لمبی شرطیں بدی جاتیں۔ پہلوان اپنے آپ کو جنسی عوارض کا بھی ماہر سمجھتا تھا۔ غرض مند کُشتے بنانے کی ترکیبیں اس سے حاصل کرتے تھے۔کہا جاتا ہے کہ پہلوان محض نسخہ ہی نہیں بتاتا، اس کے پاس تیار کشتے بھی ہوتے ہیں، لیکن وہ انہیں اپنے استعمال کے لیے رکھتا ہے، یا کسی پہ بہت مہربان ہو تو تحفتاً دے دیتا ہے۔ کُشتوں ہی کے بل بوتے پر پہلوان نے کوئی سال بھر پہلے ایک نوجوان لڑکی سے بیاہ رچایا تھا۔ دن بھر پہلوان کے پاس بٹیر بازوں، شاگردوں، پرانے ساتھیوں اور مردانہ کمزوری کی دوا لینے والوں کا تانتا لگا رہتا۔ لوگ آتے، بیٹھتے، حقّہ پیتے، گپ ہانکتے، اپنی غرض بیان کرتے، اور پھر اپنی راہ لیتے۔ پہلوان کے پاس ہر وقت رونق لگی رہتی۔ پہلوان کی بڑی

بڑی پیچ دار مونچھیں تھیں، مگر داڑھی صفا چٹ، استرے سے گٹھا سر مکھن سے چمک رہا ہوتا، جیسے وارنش کیا گیا ہو۔ کبھی کبھی مکھن کی چھوٹی سی سفید سفید ٹکیا سر کے درمیان دھری رہتی، تاوقتیکہ وہ پگھل پگھل کے ہر طرف پھیل نہ جاتی۔ قلموں کی جگہ پر دونوں جانب آدھ آدھ انچ لمبے بالوں کے گچھّے، جو مونچھوں سمیت وَسمے سے رنگے، دھواں دھار سیاہ چمک رہے ہوتے۔ پہلوان وہیں سڑک کے کنارے، بازار کے بیچ سب کے سامنے دن میں دو مرتبہ، صبح کوئی دس گیارہ بجے اور شام کوئی سات بجے، ایک بڑا پیالا، جس میں کوئی سیر سوا سیر مائع سما سکتا، لبالب بھرا گاڑھی سبز بھنگ کا نوش جان فرماتا، جسے دو تین شاگرد دو گھنٹے کی محنت سے دکان کے اندر مٹّی کے کونڈے میں بادام اور چارمغز ملا کر لکڑی کے ڈنڈے سے گھونٹتے اور ململ کی صافی میں چھان کر پہلوان کو پیش کرتے، اور پھر خود پیتے۔ حاضرین میں سے کوئی صاحبِ دل اگر دعوت قبول کرتا تو اسے بھی یہ مشروب نہایت ادب اور خندہ پیشانی سے، حسبِ طلب، فراخ دلی کے ساتھ پیش کیا جاتا۔پہلوان اسے محبت سے کبھی ساوی اور کبھی ٹھنڈائی کے خطاب سے نوازتا۔ بھنگ شہر کیا، بلکہ پورے علاقے کا ایک طرح کا قومی مشروب تھا۔ ہر عمر اور ہر طبقے کے مردوں کی اچھی خاصی تعداد اس سے شغل کرتی تھی، اور عرفِ عام میں یہ تصوّر تھا کہ موسمِ گرما کے مضر اثرات کو زائل کرتی ہے، اور اپنی ٹھنڈی تاثیر کی بدولت صفرا کو خارج کر کے طبیعت کو پُرسکون اور مزاج کو معتدل رکھتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ شائقین سردیوں میں بھی، اپنے مزاج اور طبیعت کے گرمی پر ہونے کے بہانے، اس شغل کو جاری رکھتے۔ تاہم زلفِ سبز کے اسیروں کو عام لوگ طنزیہ اور استہزائیہ فقرےبازی کا ہدف بنانے سے نہیں چُوکتے تھے۔ معاشرے کے ان باغیوں کو، جو اچھی خاصی تعداد میں تھے، معاشرے نے مذاق کی اوٹ میں، ان سے صرفِ نظر بلکہ محو کرنے کی کوشش میں، دراصل قبول کر لیا تھا، اور یوں ان بیماروں کو بغاوت کی شان اور ہیرو ہونے کے رومان سے بھی محروم کر دیا تھا۔ پہلوان کا اس عمر میں بھی بڑا دبدبہ اور رعب تھا۔ پاس بیٹھنے والوں کو اپنی جوانی کے معرکوں کی داستانیں سناتا، جو کُشتیوں کے مقابلوں، بٹیروں کی پالیوں، حسن وعشق کے قصّوں، پولیس اور دشمنوں سے ہنگامہ آرائیوں اور دوستوں کی خاطر جانبازیوں کے قصّوں پر محیط ہوتیں۔ سننے والے دم بخود، حیرت زدہ بیٹھے سنا کرتے۔ پہلوان کے متعلق مشہور تھا کہ جس زمانے میں وہ دس نمبر میں تھا تو رات کو، جب پولیس گشت پر آتی اور اس کے گھر کے باہر سپاہی حاضری لینے کے لیے بلند آواز میں پکارتا کہ "قادو خان ولد بخشو خان حاضر ہے؟"، تو یہ اپنے صحن سے اس سے بھی بلند آواز میں جواب دیتا، "ہاں اوئے ہاں، تیری ماں کا خصم حاضر ہے۔" پولیس والے بجائے ناراض ہونے کے قہقہے لگاتے ہوئے چلے جاتے کہ سلامتی اسی میں تھی۔ ہم جب زاغ سے ملنے اس کے گھر جاتے تو راستے میں پہلوان کی دکان پڑتی۔ وہ حسبِ معمول چارپائی پر محفل جمائے بیٹھا ہوتا۔ ہم سلام کر کے گزرتے۔ وہ جواب دیتا، "جی او بچڑا، جی او بابا۔" ہمیں تو کیا مجال ہوتی، لیکن اگر کوئی شخص پہلوان کے خلافِ مزاج حرکت کرتا تو وہ گالی دیتا "کھلّا ای!" اس شہر کی تہذیب کے مطابق اگر پورا ہاتھ کھول کے، اور ہتھیلی کسی کے چہرے کی طرف کر کے کھلّا کہا جائے، تو مراد ہے کہ اس کے منہ پر جوتا مارا گیا ہے، اور یہ بہت بڑی گالی اور انتہائی درجہ کی تضحیک تصور

Scanned with CamScanner

کی جاتی تھی۔ شہر کے گنے چنے خاندانی رؤسا اور معزّزین کی سواری جب ادھر سے گزرتی تو پہلوان کھڑا ہو کر اس طرح سلام کرتا کہ داہنی کہنی کندھے کے برابر تک اٹھ آتی، اور ہاتھ آدھے سر کے اوپر ہو کر نیچے آتا اور انگلیاں ماتھے کو چھو رہی ہوتیں۔ ہاتھ یوں لگتا جیسے دلھن کے ماتھے پر ٹیکا سجا ہو۔ ہتھیلی کا رخ اپنے ماتھے اور سر کی طرف رہتا تاکہ "کھلّے" کا شائبہ تک نہ گزرنے پائے۔ جب تک تانگا یا یکھی گزر نہ جاتی، پہلوان اسی پوز میں سر اور کندھے جھکائے کھڑا رہتا۔ وہ رئیس بھی، پہلوان کے پرانے رئیس ہوتے، اور رئیس خاندان سے تعلق رکھنے کی نسبت سے، نشست سے آگے بڑھ کر اور قدرے جھکتے ہوئے سلام کا جواب دیتا۔ پھر ہاتھ ماتھے سے سینے پر آ کر لحظہ بھر کے لیے رکتا، اور پھر وہ شخص معمول کے انداز میں نشست پر بیٹھ جاتا۔ تقسیم کے بعد مہاجرین کی آمد سے، اور دیہاتی آبادی کے شہروں میں وسیع پیمانے پر منتقل ہونے کے سبب، جہاں مختلف شہروں کی منفرد تہذیبی اقدار تلیٹ ہوئیں، وہیں اب اس شہر میں بھی پرانی اقدار تیزی سے سمٹتی جا رہی تھیں۔ "سائیں"، جو تعظیم کا لفظ تھا، اور کھلّا، جو تضحیک کے لیے استعمال ہوتا تھا، نوواردوں نے، بےموقع اور بےمحل، محض مذاق اڑانے اور ٹھٹھا لگانے کے لیے استعمال کر کر کے ان لفظوں کو صرف ایک کھیل بنا کے رکھ دیا۔ جہاں زندگی کا پورا کھیل ہی ہمہ وقت تغیّر پذیر اور تبدّل آشنا رہتا ہے، وہاں تہذیبی اقدار اور تمدّنی انداز کس کھیت کی مولی ہیں کہ انھیں استحکام نصیب ہو۔ شمع بیچاری ہر رنگ میں، سحر ہونے تک جلتے رہنے کی پابند ہے۔

فیزنٹ اور خرِعیسنے ایرکنڈیشنڈ ڈبوں میں سفر کرنے والے لوگ تھے، مگر ہماری خاطر تھرڈ کلاس میں سفر کر رہے تھے۔ زاغ کے اس وطیرے کے بعد ہمارے دلوں میں ان کی قدر اور بڑھ گئی۔

گاڑی چھک چھو، چھک چھو کرتی خوب تیز چلی جا رہی تھی۔ صحرا کی رات اپنی روایت کے مطابق ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ فرآٹے بھرتی خوشگوار ہوا ڈبے میں ہر کسی کو بلاتخصیص سخاوت سے خنکی تقسیم کرتی پھر رہی تھی۔ دن کی گرمی کی مار کھائے ہوئے بدن ڈھیلے پڑ کر پسرتے جا رہے تھے۔ ہم جہاں جہاں تھے، وہاں بیٹھے بلاتکلّف اونگھ اونگھ کے گرنے اور سنبھلنے میں مشغول تھے۔ ہم سے ذرا ہٹ کر تیس پینتیس سال کی عمر کا ایک شخص سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس کی کُھرپی جیسی قلمیں ڈھیلی ڈھالی پگڑی میں سے نکل کر اس کے پُررعونت چہرے پر پھیلتی، اس کی مضبوط ٹھوڑی تک پہنچتی تھیں۔ اس کی چڑھی ہوئی سرخ سرخ آنکھوں سے طلب و تمنّا ٹپکتی نظر آ رہی تھی۔ بوم، جو اولاً اپنے دلی لگاؤ سے مجبور، ثانیاً حفاظت کی خاطر، چوزے سے جُڑ کے بیٹھا تھا، غنودگی سے جو ذرا سنبھلا تو اس نے دیکھا کہ وہی شخص چوزے کے سامنے اس کا بازو پکڑے فرش پر بیٹھا تھا۔ اس کی مونچھیں جنگلی چوہے کی کانٹوں کی طرح تنی ہوئی تھیں، اور سانس پھول رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا، "منّیا توں ہوں سوھنا ایں۔ اللہ خوش رکھی، ساکو تے لٹ گھدا ای۔" چوزے کے چہرے پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ نہ بازو اس سے چھڑا رہا تھا، نہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا، نہ کسی کو بلا رہا تھا۔ بس خوف زدہ آنکھوں سے اس کا منہ تکے

جا رہا تھا۔ بوم نے ہشیار ہوتے ہوئے ڈانٹ کر پوچھا، "کیا کہتے ہو اسے؟" بوم کی بلند آواز سن کر فیزنٹ، خرِعیسنے، خچّر اور چتر بھی اٹھ کر آ گئے۔ بوم نے اس کا ہاتھ چوزے کے بازو سے پرے جھٹکا، "اوئے بازو تو چھوڑ اس کا۔" وہ نہایت بےخوفی سے بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ "نارا ض نہ تھیو صاحبا اساں جو اللہ دی حمد آکھنی ہائی، آکھ ڈتی ایہہ۔" اتنے میں اس کا ایک ساتھی مسافروں کی ٹانگیں پھلانگتا آیا، اور گھیرا ڈالے کھڑے ہم پانچ ساتھیوں کے درمیان سے اس نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا، اور پھر مسافروں کے بیچ میں سے اسے اس کی سیٹ کی طرف دھکیل دیا۔ چتر کہنے لگا، "میں زنجیر کھینچتا ہوں۔"

فیزنٹ نے کہا، "کوئی ضرورت نہیں۔ ان سے ہم خود نپٹ لیں گے۔" چوزہ اسی طرح فرش پہ بیٹھا بہکی بہکی خالی نظروں سے ہر کسی کا منہ دیکھ رہا تھا، اور ایک بات طوطے کی طرح نہایت عاجزی سے دہرائے جا رہا تھا، "لڑنا مت، لڑنا مت۔" لمبی قلموں والے کا ساتھی صاف اردو میں کہنے لگا، "میں آپ سب سے اس کی بےوقوفی کی معافی چاہتا ہوں۔ میں فوجی ہوں اور چھٹی پر گھر جا رہا ہوں۔ یہ دیکھیے میرا سروس کارڈ۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اب وہ کیا کوئی بھی آپ کا آرام خراب نہیں کرے گا۔ آپ اطمینان سے سفر کریں۔ میں ہر طرح کے تحفّظ کی گارنٹی دیتا ہوں۔ آپ میرا یقین کریں اور اس واقعے کو بھول جائیں۔ جھگڑے کو طول نہ کریں اور میری ضمانت پر اس کو یہیں ختم کر دیں۔ اسی میں آپ کا بھی مفاد ہے۔ جو کچھ ہوا میں اس پر شرمندہ ہوں اور پھر معافی مانگتا ہوں۔" اس واقعے سے دوسرے مسافروں کے ہاتھ تمسخر اڑانے کے لیے ایک پُرلطف موضوع آ گیا۔ ہر کوئی بات سے بات پیدا کرتے ہوئے اپنی اپنی بذلہ سنجی اور حاضر دماغی کا ثبوت دے رہا تھا۔ خوب تیز فقرے چست ہو رہے تھے، جو ہمارے دلوں کو یوں زخمی کر رہے تھے جیسے ریشمی کپڑے کو خاردار جھاڑی پہ ڈال کے کھینچا جا رہا ہو، مگر مسافر ان فقروں پہ بےساختہ کِھل کِھلا کے ہنس کر داد پیش کر رہے تھے۔ ہم جھینپے جھینپے فرش پہ چوزے کے ارد گرد بیٹھ گئے، کیونکہ اس کے علاوہ ہمارے پاس اس کی حفاظت کا اور کوئی چارا نہ تھا۔ ان حالات میں جھگڑے کو بڑھانا واقعی حماقت ہوتی۔ فوجی کا مشورہ درست تھا۔ اس کی ضمانت پر ہم بظاہر اطمینان کا اظہار کر رہے تھے، لیکن ہم میں کسی طور پورا اعتماد اس پر بھی جم نہ سکا۔ ہمارا حوصلہ بڑھانے کے لیے وہ بھی ہمارے پاس ہی بیٹھ گیا تھا۔ چتر نے آہستہ آہستہ کہا، "اب تک فرسٹ کلاس میں سفر کرنے والی لڑکی، اس کی ماں اور لڑکے کے خوف زدہ ہونے کا سبب آپ سب کی سمجھ میں آ گیا ہو گا۔ خود پھنسو تو تبھی پتا چلتا ہے۔" کسی نے چتر کو کوئی جواب نہ دیا۔ فوجی نے پوچھا،

"صاحب آپ کدھر جا رہے ہیں؟"

"پہاڑ پہ تفریح کے لیے۔"

"آپ نے یہ کون سا روٹ اپنے لیے چن لیا۔ یہ تو بہت خطرناک روٹ ہے، خاص طور پر جبکہ آپ کی عمریں اتنی کچّی ہیں۔"

خچر بولا، "ہاں جی خرچہ کم کرنے کے لالچ میں کچھ بھول ہو ہی گئی۔"

فیزنٹ نے کہا، "میں نے پہلے اس راستے سے سفر کیا ہے۔"

Scanned with CamScanner

فوجی نے حیرت سے پوچھا، "اکیلے؟"

"نہیں میرے ساتھ دو ملازم تھے، اور ہم فرسٹ کلاس میں تھے۔"

"تو یوں کہیں صاحب، کہ آپ نے قلعہ بند ہو کر سفر کیا تھا۔ اس پر نہ جائیں، وہ اور بات تھی۔ اجنبی کے لیے ادھر اکیلے سفر کرنا خطرناک ہو سکتا ہے۔"

گاڑی ایک اسٹیشن پہ رکی، جہاں عین گاڑی کے ساتھ ایک بلند سفید پہاڑ لگا کھڑا تھا۔ نکھری چاندنی میں وہ یوں چمک رہا تھا جیسے اس پہ سفیدی کی ہوئی ہو۔ بلکہ وہاں سے سفید پتھر پہاڑوں کا ایک سلسلہ چل نکلا، جو گاڑی کے ساتھ ساتھ دونوں طرف پَو پھٹنے تک دوڑتا چلا گیا۔ رات کے دو بجے تھے۔ صحرا کی ٹھنڈی ہوا کا سلسلہ یکدم منقطع ہو گیا، کیونکہ صحرا ختم ہو گیا تھا۔ گرمی لگنی شروع ہو گئی بلکہ پسینہ بہنے لگا۔ وہی خوف ناک شخص اپنی سیٹ پر سے اٹھ کے کھڑا ہوا، کندھے پہ دھری چادر کو درست کیا، بڑے گھیر کے تہمد کو جھاڑا، اور بلاجھجک بلند آواز میں گویا ہوا، "چنکا بھئی منّے، اساں تاں وینے آں۔ رب کیتا تاں وَل ملسُوں۔" پھر فوجی کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا، "سنکی میں تیکو جانتاں۔ کتھائیں ٹکرسوں تے لیکھا کریسوں۔" اور نیچے اتر گیا۔ چند مسافر دبی دبی ہنسی سے چہکے۔ ادھر اُدھر کچھ کھسر پھسر ہوئی جو جلد ختم ہوگئی، اور لوگ واپس نیند کی آغوش میں چلے گئے۔ فوجی نے بتایا کہ اس کا اسٹیشن صبح پَو پھٹنے کے قریب آئے گا، "اس وقت تک اجالا ہو جائے گا، اور علاقہ بھی بارونق اور مہذّب آ جائے گا، گاڑی میں شہر جانے والی سواریوں کی ریل پیل شروع ہو جائے گی۔ ویسے آپ چاہیں تو گارڈ سے بھی بات کر لیں، اب آپ کا باقی سفر انشا اللہ ٹھیک گزرے گا۔"

شام کے چار بجے ہوں گے۔ بس ہمیں اتار کر پھر چیختی ہوئی چڑھائی چڑھنے لگی۔ سڑک کے دونوں طرف ہم اور ہمارا سامان بےترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ کچھ دیر تک ہمیں انجن کا شور سنائی دیتا رہا، پھر خاموشی چھا گئی، ایسی کہ پہلے کبھی ہم نے سنی نہ تھی۔ اس ستھرے ماحول میں سامان ایک بہت غلیظ اور بےمحل چیز نظر آ رہا تھا۔ شاید ہم خود بھی اس خوبصورت گرد و پیش میں سامان سے زیادہ غیرضروری اور بےمحل چیزیں تھے۔ بائیں طرف بہت گہرائی میں دور تک دیودار کے درختوں سے بھری سبز وادی پھیلی تھی۔ آخر میں پہاڑ کھڑے تھے، بلکہ آگے پیچھے کھڑے سبز پہاڑوں کا سلسلہ، جہاں تک نظر دیکھ سکتی تھی، دوڑتا چلا گیا تھا۔ دائیں ہاتھ ہمارے بالکل ساتھ لگا، سرخی مائل مٹی میں بڑے بڑے کالے پتّھروں سے جڑا، بلند و بالا پہاڑ سڑک کے کنارے تک چڑھا آتا تھا۔ دیودار کے اونچے اونچے درختوں کے بیچوں بیچ اس پہاڑ پر ایک پگڈنڈی بل کھاتی چڑھ گئی تھی۔ پگڈنڈی پر جہاں چڑھائی یک دم زیادہ ہو جاتی تھی، وہاں پر دیودار کی موٹی موٹی شاخوں کے فریم سے بنا کر، ان میں پتھر جما کے آسانی کے لیے سیڑھیاں بنا دی گئی تھیں۔ پگڈنڈی کے شروع میں پہاڑ پر سفید رنگ کر کے کالے حروف میں "کیمپنگ گراؤنڈ" لکھا تھا، اور اوپر کی طرف اشارہ کرتا ایک تیر کا نشان تھا۔

فیزنٹ نے کہا، "چل زاغ! اوپر چل کے خیمہ لگوا اور سامان کے لیے آدمی بھیج۔"

رات زاغ نے جس خودغرضی کا ثبوت دیا تھا اس کی وجہ سے سب اس سے نارا ض تھے اور

اس کا حقہ پانی بند تھا، لیکن ہم زیادہ سختی بھی نہ کر سکتے تھے، کیونکہ جگہ کا انتظام اسی کے وسیلے سے ہوا تھا، اور خیمے وغیرہ اور رہائش کی دیگر سہولیات کا انحصار بھی اب اسی پر تھا۔ وہ اپنے کیے پہ شرمندہ تو خیر کیا ہوتا، البتّہ اتنا بخوبی سمجھتا تھا کہ زیادہ دشمنی بڑھانا اس کے لیے اچھا نہ ہو گا، اور پھر فیزنٹ بھی موجود تھا، جس سے اس کی جان جاتی تھی، اس لیے سدھے ہوئے جانور کی طرح اپنے فرائض بلاچون و چرا ادا کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں زاغ ایک سفیدجامہ آدمی کے ساتھ پگڈنڈی سے نیچے اترا آ رہا تھا۔ قریب پہنچ کر اس شخص نے بتایا، "قلی یہاں نہیں ہوتے، ہر کوئی اپنا سامان خود اوپر لے کر جاتا ہے۔ خیمہ آپ کے لیے نصب ہو رہا ہے۔ لالٹین صاف کر کے تیل سے بھر دی گئی ہے۔ میں اپنے گھر جا رہا ہوں۔ کل صبح نو بجے واپس آؤں گا تو آپ کے لیے نوکر لیتا آؤں گا، جو کھانا بنانا جانتا ہے۔ خیمہ لگانے والے دونوں آدمی بھی رات کے لیے اپنے گاؤں چلے جائیں گے اور صبح لوٹیں گے۔ یہاں کسی درندے وغیرہ کا کوئی خطرہ نہیں۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔ السلام علیکم!" وہ وادی میں اترتا چلا گیا۔ وادی کی پوری گہرائی میں دو میل نیچے ایک روڈ کے کنارے ننھا سا کوٹھا تھا، جس سے بل کھاتا دھواں اٹھ رہا تھا۔ شاید وہ اسی کا گھر تھا، اور بیوی اس کے لیے کھانا پکا رہی تھی۔ یہ سوچ کر ہمارے منہ میں پانی بھر آیا، اور بھوک یک بارگی بھڑکتے شعلے کی طرح سر اٹھا کر پیٹ میں لہرائی۔ گھر آسائشوں کی یاد اعضا میں گھومی پھری، اور آخر ٹھٹھک کر وہیں دبک گئی۔ ہم کچھ دیر ہکّا بکّا سے کھڑے رہے، پھر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ جب سپاٹ چہروں پہ دیکھنے کو کوئی چیز نہ ملی تو ہر ایک نے طعنہ زن نظروں سے زاغ کو دیکھا۔ یہ شخص ہمیں بہلا پھسلا کر یہاں لانے کا ذمےدار ہے؛ اتنے دنوں سے چرچا کر رہا تھا، وہاں چلو، پُرسکون ماحول ہو گا، سبزہ، پہاڑ، میٹھی میٹھی خنکی ہو گی، خوبصورت نظارے ہوں گے، خاموشی ہو گی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے ہمارے دلوں نے گواہی دی کہ زاغ سچا تھا؛ یہ سب کچھ تو موجود ہے۔ حقیقت دراصل یہ ہے کہ ہم تن آسانی اور آرام و آسائش کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ سفر کی ذرا سی صعوبت اور معمول سے ہٹ کر رہنےسہنے کا انداز، جو دلچسپی کا سبب ہونا چاہیے تھا، ہمارے لیے ناقابلِ برداشت بن گیا، اور ہم بوکھلا اٹھے۔

فیزنٹ نے کہا، "باورچی ساتھ لانا چاہیے تھا۔"

خچّر نے کہا، "ایک رات کی تو بات ہے۔ کل وہ بابو ملازم لے آئے گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ایک وقت کا کھانا پکانا ہے، وہ ہم خود پکا لیں گے۔" پھر سب خاموش ادھر اُدھر دیکھنے لگے۔ خچّر بولا، "یہیں بت بنے کھڑے رہنا ہے یا سامان اٹھانے کے لیے بھی کوئی ہاتھ ہلائے گا؟" خچّر آگے بڑھ کر آٹے کے تھیلے کو تولا، اور اٹھا کر کندھے پر رکھ لیا۔ ایک ہاتھ میں سوٹ کیس پکڑا اور بغل میں بستر دبایا، اور چلتے ہوئے پوچھا، "کتنی بلندی ہو گی؟"

"یہی کوئی ڈیڑھ دو سو فٹ"، زاغ نے بتایا۔

آخر سب کو سامان اٹھاتے اور اوپر پہنچاتے ہی بنی۔

آخری سیڑھی پہ پاؤں رکھا تو سامنے کھلا میدان تھا، جو تقریباً ایک فٹ بال گراؤنڈ جتنا تھا۔ درمیان میں ایک خیمہ رسّیوں سے جکڑا، کسی فلم کے قیدی ہیرو کی طرح تن کے کھڑا تھا

Scanned with CamScanner

س کا تکونا دروازہ کھلا تھا، اور کینوس کے دونوں پٹ اس کی اطراف پر پڑے تھے۔ پورے میدان
لے اردگرد چیڑ کے بڑے بڑے تن آور درخت گھیرا دیے کھڑے تھے۔ پورے میدان کے پیچھے جنگل
تھا، جو ہر طرف بےمحابا پھیلتا چلا گیا تھا۔ جنگل کے اندر ننھے ننھے زرد، سفید اور بنفشئی
پھولوں سے لدی جھاڑیاں تھیں، سانپوں جیسی بیلیں تھیں، جنگلی بُوٹیاں تھیں اور گھٹنوں گھٹنوں
ونچی گھنی گھاس تھی کہ جن کے سبب چند قدم چلنا دشوار تھا۔ خیمے کے اندر سبز گھاس کا
رش بچھا تھا، اور جھک کر جھانکتے سورج کی صاف تیز روشنی میں گھاس کا ایک حصہ
جھچاتا گاتا ایسا سبز تھا کہ ویسا ہم نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ ہمیں اس وقت کچھ سُجھائی
ہ دے رہا تھا۔ زمین و آسمان کی ہر سمت اور ہر نہج کا کھوج ہمارے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔
ہ رہ کے صرف دو چیزوں کا خیال آتا تھا، تیار کھانا اور آرام۔ کھانا تو صبح تک ملنے کی کوئی
وقع نہ تھی۔ پتا نہیں خشک راشن رکھتے وقت یہ خیال کیوں نہ آیا کہ راشن اور تیار کھانے کے
رمیان تکمیل طلب مراحل کی لمبی فہرست ہوتی ہے۔ ہم نے کیسے خشک اشیا کو کافی و شافی
سمجھ لیا؟ بھوک اور تھکاوٹ نے ہمیں اندھا کر رکھا تھا۔ ہم ہر ایک سے برہم تھے، اور سب سے
یادہ اپنے آپ سے۔ ہم میں سے ہر ایک گھاس کے فرش پر اوندھے منھ گر پڑا۔ پتا نہیں کتنی دیر
نہیں پڑے رہے۔ ہوش آیا تو دیکھا کہ چتر پاؤں کی ٹھوکر سے فیزنٹ کو زندہ کرنے کی کوشش کر
ہا ہے، "اٹھو، جب تک مَرے نہیں جاتے تو کسی طور ہٹیں۔" باہر چاندنی پھیلی تھی۔ فیزنٹ نے
نکھیں ملتے ہوئے کہا، "ہاں یہ بات تم نے ٹھیک کہی ہے۔" آسائش کے اس سامان کو، جو سینکڑوں
ل سے ہماری زحمت کا سبب بنا آ رہا تھا، اب کھولا گیا کہ ہمیں آسائش پہنچائے۔ کسی نے کہا،
انی؟" سب یک زبان بولے، "ہاں پانی؟" بابو نے اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ روشنی کے
ے لالٹین کا ذکر کر رہا تھا، وہ تو عین خیمے کے بانس سے لٹک رہی ہے۔ اس کے اندر مٹی کا تیل
رتا ہے پانی نہیں۔ میٹھی نرم چاندنی اور ہلکورے لیتی خُنک ہوا میں ہم سب ہر چہار طرف
ڑے بھاگے، مگر پانی کا کہیں نشان نہ تھا۔ ٹھنڈی ہوا میں دھیرے دھیرے جھولتے دیودار کے
د قامت درخت مزے سے کھڑے اپنی جڑوں کے ذریعے زمین سے پانی چوس رہے تھے۔ ہماری
ڑیں تو پتا نہیں کہاں تھیں۔ پانی تو اور بھی کہیں دور ہو گا۔ اب کیا کریں؟ سڑک پہ کوئی پانچ
ے پہلے پہاڑ کی کوکھ سے شرشر بہتا ایک جھرنا دیکھا تھا؛ اگر کمیٹی والے رات نو بجے اسے بند
یں کر دیتے تو اب تک بہہ رہا ہو گا۔ وہاں سے پانی لایا جا سکتا ہے۔ کون لائے گا وہاں سے
؟ چتر نے تجویز دی کہ "فیزنٹ، خجّر اور بوم جائیں۔ یہ ہم میں سب سے زیادہ تنومند ہیں۔"
بوم نے کہا، "ٹھیک ہے، ہم جائیں گے، لیکن شرط یہ ہے کہ چتر ہمارے ساتھ چلے۔ برتن اور
ی بےشک نہ اٹھائے۔"
چتر نے پوچھا، "وقت کیا ہے؟"
زاغ نے گھڑی دیکھی اور کہا، "ڈیڑھ بجا ہے۔" ویسے تو فیزنٹ اور خرعیسے کی کلائیوں پر
گھڑیاں بندھی تھیں، لیکن انھیں گھڑیاں دیکھنے کی تاب نہ تھی۔
چتر نے کہا، "ارے عقل مندو! جتنی دیر میں ہم بارہ میل سفر کر کے پانی لے کر لوٹیں گے، اتنی
میں تو دن ہو جائے گا، اور پانی ہمیں یہیں کہیں سے مل جائے گا۔ یقیناً وہ دور نہ ہو گا۔

ویسے جس جس کو پیاس لگی ہے وہ ہاتھ کھڑا کرے۔" چھ ہاتھ کھڑے ہو گئے۔ چتر کہنے لا
"کوئی بات نہیں، بس ذرا صبر کی ضرورت ہے۔ ابھی صبح ہو گی تو پانی کیا چیز ہے، چائے ا
کھانا بھی ملے گا۔"
دور مغرب میں، بابو کے گھر والی وادی کے پار جو پہاڑ تھے، ان پر بجلی چمکنے لگی۔ ہوا تی
ہو گئی۔ دیودار کی لٹکتی جھالروں جیسے، سوئیوں کی طرح باریک اور لمبے پتّوں کے گچھوں م
سے سیٹیاں بجاتی ہوا کی شوں شاں سنائی دینے لگی، جو لحظہ بہ لحظہ تیز ہوتی چلی گئی۔
حیران تھے کہ ہوا خوب تیز ہے، لیکن بالکل صاف اور مصفّا، کہیں مٹی کا ایک ذرہ نہیں۔ ا
وطن میں ہوا اتنی تیز ہوتی تو ہر سمت اڑتی مٹی اور ریت کے دَل کے دَل ہر چیز کو اندھا
دیتے؛ نتھنے سانس لینے سے عاجز ہوتے۔ ہوا کی پاکیزگی ہمیں دھوکا دے گئی۔ ہمیں شائبہ تک
گزرا کہ وہ اتنی تیز ہے۔ پل بھر میں تن کے کھڑا بظاہر مستحکم خیمہ دور لوٹتا جا رہا تھا۔ چا
کے طباق سے روشن چہرے پر پہلے نمی سے کہر سی چھا گئی، اور پھر اس نے بادل کے آنچل م
منہ چھپا لیا۔ وہاں شاید بارش کا پہلا قطرہ گرنے کا کوئی دستور نہ تھا۔ ایک سرّاٹا آیا، اور بار
چابک برساتی نکل گئی، پھر دوسرا، پھر تیسرا، پھر تابڑ توڑ۔ شام سے بےترتیبی سے بکھر
سامان کو جلدی جلدی اکھٹا کیا اور اس پر خیمے کی ترپال ڈال دی۔ پھر ہم نے منھ کھول کھو
کے مینھ کے پوتّر پانی سے بھڑکتی پیاس بجھائی، اور پھر ساون کی پہلی برکھا میں کھیلتے کتّوں
طرح ایک دوسرے کے پیچھے سرپٹ بھاگتے، زمین پر لوٹتے، آپس میں گتھم گتھا ہوتے، کھیلتے رہ
پھر اس سے تھک گئے۔ ہوا تھم گئی تھی، لیکن بارش تھی کہ برسے جا رہی تھی، دھمادھم ا
چھماچھم۔ ہم ایک ایک، دو دو میں بٹے، سر ہتھیلیوں پہ رکھے، کٹ کٹ بجتے دانتوں
سنبھالتے، بھیگے گیدڑوں کی طرح بیٹھے تھے۔ ہمیں تو جانوروں کی طرح اپنا آپ جھٹک کے پا
بالوں سے جھاڑنے اور جلد خشک کرنے کی بھی تمیز نہ تھی، بس کھلے میدان میں چپ چاپ بیٹھ
بھیگتے جا رہے تھے۔ اتنے میں پٹاخ کی آواز ابھری، اور چوزے کی آواز میں گالیوں کی بوچھ
سنائی دی۔ ہم سب اُدھر لپکے تو اتنے میں زاغ نے اوپر تلے دو تھپڑ چوزے کے چھوڑ دیے۔ بارش
جیسے یک دم شروع ہوئی تھی، ویسے ہی فوراً بند ہو گئی۔ ڈھلا ڈھلایا چاند سامنے چمک ر
تھا، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ چوزے نے بتایا کہ "زاغ پہلے برابر بیٹھا کہتا رہا کہ خدا کے لیے کس
سے کہنا نہیں، میں تیری محبت میں بالکل پاگل ہو گیا ہوں۔ میں چپ سنتا رہا۔ پھر اس نے میر
کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا، اور اپنی طرف کھینچ کر بوسہ لینا چاہا تو میں نے اٹھ کے ایک تھپڑ لگ
دیا۔" فیزنٹ نے زاغ سے پوچھا، "تُو ہمارے سفر کو بدمزہ کرنے پر کیوں تُلا ہے؟" ہم سب کو زا
کی اس حرکت پر بڑا رنج تھا، اور فیزنٹ ہماری ٹھیک نمائندگی کر رہا تھا۔ زاغ نے جواب دی
"چوزہ تو ایسے ہی بکواس کرتا ہے۔ میں نے ذرا مذاق میں بات کی تو اس نے اس کا بتنگڑ بنا لیا۔
فیزنٹ نے ایک زنّاٹے کا تھپڑ اس کے منھ پر دیا، اور چوزے کو ہاتھ سے پکڑ کر کھینچا، "حرامی! ت
اس کے ساتھ بیٹھا ہی کیوں تھا؟"
"میں کہاں اس کے ساتھ بیٹھا تھا۔ یہ خود میرے پاس آ کر بیٹھ گیا تھا۔"
بوم، خجّر، خرعیسے اور چتر، چاروں فیزنٹ کے پیچھے یوں لائن بنا کے تیار کھڑے تھے کہ اگ

Scanned with CamScanner

زاغ نے ذرا بھی ردِعمل دکھانے کی کوشش کی تو اسے بچھا کے رکھ دیں گے۔ ویسے بھی وہ فیزنٹ سے لڑنے کی کہاں جرأت رکھتا تھا۔ رہی سہی ہمّت سب کے تیور دیکھ کر جواب دے گئی ہو گی۔ وہ گال سہلاتا ایک طرف کو چل دیا۔ چوزہ کپکپاتا کھڑا بیبسی سے رو رہا تھا۔ ہم سب اسے لاسا دے رہے تھے، اور پوچھ رہے تھے کہ بدلہ تو تمھارا لے لیا گیا، پھر کیوں رو رہے ہو۔

"زاغ سے ڈرتے ہو؟"

"نہیں۔"

"گھر یاد آ رہا ہے؟"

"نہیں۔"

"پھر کیوں روئے جا رہے ہو؟"

"مجھے نہیں پتا۔ روتے رہنا میری عادت بن گئی ہے۔"

گیلے کپڑوں اور ٹھنڈی ہوا نے مل کر سردی ہماری ہڈیوں میں اتارنی شروع کر دی، اور ہم اختیار کانپنے لگے۔ چتر نے خچّر کو بازو سے پکڑا اور کہا، "آؤ، کچھ ٹہنیاں چن کے لاتے ہیں۔ باز کی لکڑی گیلی ہو تب بھی جلتی ہے۔ ہمارے پاس تو مٹی کا تیل بھی ہے۔"

ایک پورا دن اور ایک پوری رات سو کر ہم بہت حد تک جسمانی طور پر بحال ہو چکے تھے، اور گرم کوٹ پتلون پہن کر صبح نو بجے قصبے کی طرف پکی سڑک پہ چڑھائی چڑھتے آہستہ آہستہ چلے جا رہے تھے۔ چتر اور فیزنٹ نے تو قصبے جانے کے شوق میں نکٹائیاں بھی خوب محنت سے باندھ کر گلوں میں سجا رکھی تھیں۔ چند بسیں جو قریب سے گزریں، انھیں سوار ہونے کے اشارے ہاتھ دیا، لیکن پانچ چھ میل کی معمولی مسافت کے لیے کوئی ڈرائیور ہمیں بٹھانے میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا، یا بسیں پہلے ہی سے اتنی پُر ہوتیں کہ سات مزید اشخاص کی ان میں گنجائش ممکن نہ تھی، اور وہ تیزی سے آگے بڑھ جاتیں۔ دائیں ہاتھ پہاڑ اور بائیں ہاتھ گہری وادی ہمارے ساتھ ساتھ چلتے۔ کبھی پرے ہٹ جاتے، کبھی نزدیک ہو جاتے۔ ننھے ننھے رنگا رنگ پھول، نازک نازک پودوں اور جھاڑیوں میں لہلہاتے، جگہ جگہ ہمارے قدم روک لیتے۔ جنگلی گلاب کی کلیاں، جو ادھر ادھر رینگتی ہوئی پھیلی تھیں، فیزنٹ نے خاص طور پر ہمیں دکھائیں۔ گلاب اور جنگلی؟ ہم حیرت زدہ رہ گئے۔ اس نام میں متضاد الفاظ کا عجیب میل تھا۔ ہم بہت دیر تک ان پھولوں کا جائزہ لیتے رہے۔ چھوٹے چھوٹے جنگلی گلاب کے سفید براّق سے پھول ان میں ٹکے تھے۔ ان کے درمیان میں بنانے والے نے زردہ گل کا اہتمام بھی کر رکھا تھا، مگر گلاب اس لحاظ سے بالکل جنگلی تھا کہ خوشبو سے قطعی عاری تھا۔ سنگلاخ پہاڑ کی اٹھتی ہوئی عمودی دیوار پہ کہیں کہیں دیودار کے درخت سنبھل کے سربلند کھڑے تھے۔ دوسری طرف وادی میں درختوں کی چوٹیاں ہمارے قدموں سے بھی نیچی تھیں۔ کہیں دو چٹانوں کے بیچ میں سے باہر نکلا نازک سا پودا، نظر کسی مہین ٹہنی پہ ایک آدھ پھول تھامے، بازو بڑھائے، نہایت ہی جواں مردی سے کھڑا دکھائی دیتا۔ کچھ چشمے ڈھیر سی کائی میں پھنسے، رِس رِس کے بہتے دکھائی دیے، جو اپنے محدود ذرائع سے آبشار بنانے کی اپنی سی کوشش کر رہے تھے۔ دھوپ بہت چمکدار تھی، اور تیز اتنی کہ جہاں

پڑتی سوئیاں سی گھونپ دیتی۔ آسمان کی طرف لپکتے ہرے رنگ کی ایسی فراوانی مچی تھی کہ ہم تو ساون کے اندھے بن کر رہ گئے۔ فیزنٹ اور چتر کی نکٹائیاں تو پہلے میل ہی میں اتر گئیں۔ دوسرے میل کے اختتام تک ہر کسی کا کوٹ اتر کر کندھوں پہ آ گیا۔ پہلے ایک مکان دکھائی دیا۔ پھر سڑک کے کنارے ٹوکری میں زردے جیسی چمکتی ہوئی پیلی خُرمانیاں ڈالے ایک لڑکا بیٹھا تھا۔ وہ خوانچہ فروشوں کی طرح آواز لگانی نہیں جانتا تھا، آنے والوں سے ذاتی سی التجا کر رہا تھا، "صاحب خُرمانی لے لو، بہت میٹھی ہے۔" گویا یہاں سے قصبے کی باقاعدہ ابتدا ہو گئی تھی۔ پھر بنگلے شروع ہو گئے، پرانی وضع کے، خوب بڑے بڑے۔ درختوں اور جھاڑ جھنکاڑ کی بہتات میں پرانی عمارت کہیں پیچھے کھڑی شرمائی شرمائی جھانک رہی ہوتی۔ لکڑی کے میلے بوسیدہ دروازوں والی، نیچی نیچی، گارے سے چُنے گئے پتھروں کی بنی، اکّادکّا دکانیں کھلی تھیں۔ وہ اپنے سامانِ فروخت کی نوعیت کے لحاظ سے، آٹا تیل بیچنے والی میدانی دکانوں جیسی غلیظ تھیں، اور مکھیوں سے بھنبھنا رہی تھیں۔ کایک البتہ زرد رُو اور چھوٹے قد کے، دھیمے دھیمے، عاجز سے لوگ تھے۔ ان کے نزدیک اکڑفوں، بدنی طمطراق اور طاقت کا استعمال، زندگی کے مسائل کا حل نہ تھا، اور شاید ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ گرمی اور چھ سات میل کی پیہم چڑھائی نے ہم تساہل پسندوں کو تھکا دیا۔ فیزنٹ، جو پہلے کئی مرتبہ اس پہاڑی قصبے میں گرمیاں گزار چکا تھا، ہمارا راہ نما تھا۔ اس نے تجویز دی کہ "بڑے بازار پہنچنے کے لیے شارٹ کٹ لگاتے ہیں، لیکن اس میں چڑھائی یک دم سیدھی پڑتی ہے۔" سب نے کہا، "کوئی بات نہیں، اسی سے چلتے ہیں۔" وہ ایک تنگ سی گھاٹی چڑھنے لگا۔ لمبی گھاٹی ختم ہوئی تو ہم ایک ہونکتے ہوئے میدان کے کنارے کھڑے تھے۔ اس میں درخت اور پودے ڈھنگ سے قطاروں میں لگے تھے۔ جگہ ٹھنڈی تھی۔ آسودگی کا احساس ہوا۔ ہم وہاں سستانے بیٹھ گئے۔ ارد گرد ایک دائرے میں مکانوں کا جُھرمٹ تھا۔ عورتیں، بچے، نوکر، نوکرانیاں، پھیری والے، اور پتا نہیں کون کون وہاں پھر رہے تھے۔ کوئی لڑ رہا تھا، کوئی کھیل رہا تھا، کوئی آ رہا تھا، کوئی جا رہا تھا۔ غرض ایسی گہماگہمی اور مصروفیت کا عالم تھا کہ لگا جیسے ہم مکھیوں کے بڑے سے چھتّے میں پہنچ گئے ہوں۔

ان مکانوں کے اوپر مکانوں کا ایک اور سلسلہ تھا۔ ان کی کھڑکیاں بھی ادھر ہی کھلتی تھیں، لیکن ان کے دروازے نہ معلوم کدھر کدھر اور کن کن سڑکوں پر کھلتے تھے۔ رونق اور آرام میں کچھ ایسا دل لگا کہ کسی کی طبیعت اٹھنے کو مان نہیں رہی تھی۔ آخر فیزنٹ اٹھا، اور اس نے کوچ کا نعرہ لگایا، "اٹھو! اور آگے چلو۔ اگر دیر ہو گئی تو سمجھو کہ چار بجے تک کے لیے بازار کے اصل نظارے سے محروم ہو گئے۔ لوگ دوپہر کے کھانے کے بعد آرام کرتے ہیں، اور پھر شام کو نکلتے ہیں۔" مکانوں کے درمیان میں سے تنگ سیڑھیوں کا پیچ در پیچ لمبا سلسلہ تھا، جو اوپر کھلی سڑک پر جا نکلتا تھا۔ فیزنٹ چڑھنے لگا۔ ہم بھیڑوں کے گلّے کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چڑھنے لگے۔ جیسے جیسے ہم چڑھتے جا رہے تھے، ویسے ویسے سیڑھیوں کے قریب قریب شہر کے گھر کھلی کتاب کی طرح اپنے اسرار و رموز ہم پر منکشف کرتے جا رہے تھے۔ عورتیں بازو چڑھائے، دوپٹے الٹائے، ننگے سر، کھانا پکانے میں محو تھیں۔ کہیں کپڑے دھل رہے تھے، کوئی بال سُکھا رہی تھی۔ بچوں کو نہلایا جا رہا تھا۔ بچے کہیں ہنس رہے تھے، کہیں رو رہے تھے۔ کچھ ننگ

Scanned with CamScanner

دھڑنگ کھیل میں منہمک تھے۔ جو نہا چکے تھے، وہ اجلے لباس پہنے بال بناتے کھڑے ہمیں دیکھ رہے تھے، جیسے ہم کوئی نئی قسم کے جانور ہوں۔ بچے نئے جانوروں اور اجنبی انسانوں کو حیرت اور خوشی کی ملی جلی نظروں سے دیکھتے کیا گھورتے ہیں۔ ہم نے پایا کہ ہر گھر ویسا ہی ایک گھر ہوتا ہے، جیسے کہ ہمارے اپنے گھر ہیں۔ ایک سی ضروریات، ایک سے تقاضے، اور ایک سے ان کو پورا کرنے کے ڈھنگ۔ تو پھر پرائیویسی پر اس قدر اصرار کیوں؟ پرائیویسی بھی شاید لباس کی طرح تہذیب کی متعارف کردہ ایک چیز ہے، اور اسی کی طرح ایک اضافی اور بناوٹی چیز، جس کی بنیاد انا پر ٹھہرائی گئی ہے۔ ایک کھڑکی میں، لمبی، سانولی سی، مگر دل کو اچھی لگنے والی لڑکی بڑے انہماک سے کھڑی بال بنا رہی تھی۔ ہمیں دیکھا تو بال بنانا بھول، ہماری طرف متوجہ ہو گئی۔ پھر ایک بڑی سی دلنواز مسکراہٹ پھینکی، جو کہہ رہی تھی کہ ہاں! مجھے دیکھو اور داد دو۔ اس کے بعد وہ آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ ہم سب کے پاؤں پہلے ٹھٹھکے، اور پھر بیارادہ رک گئے۔ فیزنٹ جو خود بھی اسے دیکھ رہا تھا، پکارا، "یہ جگہ رکنے کی نہیں۔ خطرہ ہے، جلدی چلو، جلدی۔ تاک جھانک کرتے کسی نے دیکھ لیا تو مار مار کر دنبے بنا دیں گے۔"

چتر نے بیزار ہو کر کہا، "جب کبھی میری زندگی میں کوئی اچھی بات ہونے لگتی ہے، تو یہ فیزنٹ ہمیشہ جلدی مچا دیتا ہے۔ بیوقوف آدمی، جلدی چلو، جلدی چلو کی رٹ لگائے جا رہا ہے، جیسے وہاں بڑے بازار میں ہمارا کوئی منتظر بیٹھا ہے۔"

سیڑھیاں ختم ہوئیں تو ہم ہانپ رہے تھے۔ چندے رک کے سانس درست کیا، اور پھر سڑک کی چڑھائی چڑھنے لگے۔ ڈیڑھ دو سو گز کے بعد ایک بڑا سا چوک آیا۔ سامنے ڈھلوان میں پل کھاتا ہوا بازار دور تک ہمارے سامنے پھیلا تھا، اور اس میں متحرک انسانوں کا جمِ غفیر، ایک طرف دکانوں کی قطار، اور دوسری طرف پہاڑ کے درمیان پابند سڑک کے کناروں کے اندر رہنے پر مجبور، ایک دوسرے کو ٹھانھیں مار رہا تھا۔ یا اللہ، خلق کا یہ اژدھام یہاں کس کام میں مصروف ہے؟ دیکھنے میں، یا محض اپنا آپ دکھانے میں؟ یا رنگین قبا حسیناؤں کو تاکنے میں؟ فیزنٹ نے بتایا، "آج اتوار ہے اسی لیے اتنا رش ہے۔ اتوار کو قریب کے شہروں کے لوگ تماشا دیکھنے چلے آتے ہیں۔" ہم بھی اس ہجوم میں کود گئے۔ آگے بجری کی پھنیچر سی سڑک تیزی سے ڈھلوان میں اترتی جا رہی تھی۔ دوسری طرف یک دم بہت گہرائی میں ایک وادی تھی جو دور تک پھیلی تھی، اور آگے بلند و بالا سلسلۂ کوہ تھا۔ اس سُونی جگہ پر دھوپ کا نکھار دیدنی تھا، اور اس میں سرسبز و شاداب سبزہ ہر طرف مست و سرشار پڑا، نیلے آسمان تلے پھیل رہا تھا۔ اس سفر میں بھوک اور تھکان، جن سے ہم گھر کی پناہ گاہوں سے نکل کر ابھی پہلے پہل متعارف ہوئے تھے، ہمارے ازلی دشمن، گھات لگائے بیٹھے تھے، اور ان سےکوئی جائےاماں موجود نہ رہی تھی۔ دل ایک دشمن کو باتوں سے بہلانے کی کوشش کرتا، تو دوسرا دھڑا دھڑ وجود کا دروازہ پیٹنا شروع کر دیتا۔

ہم نے سفر پر نکلنے سے پہلے یہ طے کر لیا تھا کہ بچت کی خاطر صبح خیمے سے کھانا کھا کر چلنا ضروری ہو گا۔ دن بھر قصبے میں گھومیں، حسین چہرے تاکیں، اور شام کو خیمے میں واپس پہنچ کر کھانا کھائیں؛ مگر یہ اندازہ نہ لگا سکے کہ آدھ میل کے پیدل پہاڑی سفر سے یوں مقررہ وقت سے پہلے اتنی شدید بھوک کا الاؤ بھی بھڑک سکتا ہے۔ غرضیکہ ہم سب دوست بہت بھوکے

تھے؛ اور کیسوں کی تہی دامنی بھی سب پہ آشکار تھی۔ کوئی کیا تجویز دیتا کہ کیا کرنا چاہیے۔ غریب اور امیر ہم سفروں کے مابین ،کم از کم سفر کے دوران، مالی برابری قائم رکھنے کے لیے، آغاز میں صرف بیس بیس روپے زادِ راہ لے کر چلنے کی ٹھہری تھی، لیکن یہ تو شروع میں ہی کھل گیا کہ فیزنٹ، زاغ اور خرگیسے نے اس شرط کی پابندی نہیں کی۔ وہ اپنے وسیع وسائل کی بدولت ایسا کر سکتے تھے، جبکہ دوسرے چاہتے بھی تو اس قابل نہ تھے کہ ایک پیسہ بھی زائد فراہم کر سکتے۔ اب کھانے کی بات لبوں پر لانا اسی کو زیب دے سکتا تھا، جو سات آدمیوں کا کفیل بننے کے لیے والنٹیر کرتا۔ لیکن ایسا شاید ممکن نہ تھا۔ ان تینوں میں سے ہر کوئی اس کا اہل تھا، لیکن قصہ صرف ایک وقت کا کھانے کا تو نہ تھا، ابھی چار پانچ روز تک مسلسل قصبے آنے کا پروگرام تھا۔ باقی چار تو ایک وقت کھانے کے بھی پیسے دینے کی استطاعت نہ رکھتے تھے۔ مگر ساتھ ہی یہ سوال بھی پیدا ہوتا تھا کہ ان تینوں میں سے کوئی ایک وقت کے کھانے کی دعوت بھی بھلا کیوں دیتا۔ سب بُت بنے خاموش بیٹھے تھے؛ اندر ہی اندر بھوک سے بلبلا رہے تھے اور بظاہر نظارۂ فطرت کرنے میں محو تھے۔ پھر کسی نے بڑا کرم کیا اور تکلیف دہ سکوت کو توڑا، "آؤ چلیں۔"

"ہاں! چلو۔"

چتر نے کہا، "بھئی اتنی دور سے رونق دیکھنے آئے ہیں۔ اب کچھ اور نہیں تو رونق ہی پیٹ بھر کے دیکھیں۔"

وہی سانولی لڑکی، سیاہ بالوں میں سرخ گلاب کا پھول سجائے، سہیلی کو ساتھ لیے، ایک دکان سے نکل کر دوسری میں داخل ہوئی۔ اس کا چہرہ ہلکی لپ اسٹک اور روج سے یوں دمک رہا تھا جیسے شفق پر سرمئی بادل چھائے ہوئے ہوں۔ ہم بھی ان کے پیچھے دکان میں جا گھسے۔ اس نے ایک مرتبہ پلٹ کر دیکھا کہ کہیں عشاق بےتوجہی سے ہمت نہ ہار بیٹھیں۔ وہ شالیں دیکھنے لگیں، اور ہم ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ بوم، چوزہ اور خچّر تو دست بردار ہوتے ہوئے باہر نکل گئے۔ پھر زاغ بھی چلا آیا۔ چتر، خرگیسے کے کان میں برابر کچھ کہہ رہا تھا۔ فیزنٹ نے پہلے شہتوت کی شاخوں سے بنی ٹوکریاں دیکھیں، پھر چھڑی منتخب کرنے لگا۔ خرگیسے نے، غالباً چتر کی ترغیب پر، ٹوتھ پیسٹ اور صابن کی ٹکیا خریدی۔ فیزنٹ نے چھڑی خرید لی، شاید اس لیے کہ زاغ کو راہِ راست پر رکھنے کے لیے وقت پر کام آ سکے۔ لڑکی نے شال خریدی، اور دونوں اپنے گھر کے رخ چل پڑیں۔ وہ تینوں ان کے پیچھے تھے۔ زاغ بھی لپک کے ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ اب چاروں ان کا پیچھا کرتے جا رہے تھے، اور کہیں پیچھے باقی تینوں چلے جا رہے تھے۔ لڑکیوں نے ایک بار مڑ کے ان پر نظر ڈالی اور ہنس دیں۔ ان چاروں کے لیے تو لڑکیوں کی قربت اور ہمّت افزا ہنسی، جو ان کی آتشِ شوق تیز کر رہی تھی، ان کے چلتے جانے کا کوئی جواز تھی، مگر باقی تینوں پتا نہیں کس موہوم آس کے برتے پر اتنی دور پیچھے چلے جا رہے تھے۔ ان کی بددلی کا یہ عالم تھا کہ ان کا فاصلہ دم بدم بڑھتا جا رہا تھا، مگر پیچھے چلے ضرور جا رہے تھے۔ سڑک کی ڈھلوان ختم ہوئی تو سیڑھیاں اترنے سے پہلے ان دونوں نے پھر مڑ کر دیکھا، پھر ہنسیں، اور نیچے اتر گئیں۔ فیزنٹ نے تینوں کو یہ کہہ کر ان کے پیچھے سیڑھیاں اترنے سے روک دیا، "کیوں؟ جوتے کھانے کا ارادہ ہے کیا؟"

Scanned with CamScanner

اس احاطے سے خارج ہونے لگے، اور منتظر ہجوم سنیما کے اندر گھسنے لگا۔ جلد ہی میدان خالی رہ گیا، جس میں چند ایک چھابڑی والے ایک دوسرے پہ آوازے کستے ہوئے دھول دھپّا کرنے لگے۔ یہ تماشا بھی انجام کو پہنچا۔ سوال تھا کہ اب کیا کیا جائے۔ ہم پاؤں گھسیٹتے واپس بازار کے رخ

ہم سب واپس پھر بڑے بازار میں اتر آئے۔ بازار میں سے بائیں طرف نیچے گلیاں نکلتی تھیں، جن میں تکّے کباب والوں اور روٹی سالن بیچنے والوں کی دکانیں تھیں۔" وہ لوگ، جنھوں نے اپنے گھٹیا سماجی مرتبے کو پہچان کر اسے قبول کر لیا تھا، مزے سے ان گلیوں میں اتر کر بےتکلفی سے اپنے حصے کا رزق کھا رہے تھے۔ اگر صرف بوم، چوزہ، خچّر اور چتر، یہی چار آدمی آپس میں ہوتے، تو بلا تردّد ان لوگوں کے ساتھ شامل ہو کر کسی گندی بدبودار گلی کے کنارے بیٹھے نان کباب اڑا رہے ہوتے، لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ وہ فیزنٹ، خرگوش اور زاغ جیسے خاندانی اشراف کے ساتھ پھنس گئے تھے، جن کا سماجی وقار یوں گلی میں ہر ہماشما کے ساتھ بیٹھ کر کھانے میں ملیامیٹ ہو کر رہ جاتا۔ اس پہ وہ آمادہ نہ تھے، اور سات آدمیوں کے کھانے کا بل کسی اچھے ریستوران میں اکیلے دکیلے میں ادا کرنے کا حوصلہ نہ تھا۔ وہ تینوں چندہ کر کے ساتوں کا بل دینے پر تیار ہو سکتے تھے، لیکن باقی چاروں کی غیرت یہ تذلیل کیوں کر برداشت کرتی۔ نتیجتاً سبھی اپنے اپنے تضادات کے گرداب میں پھنسے، ابھی تک بھوک کا بار صبر سے برداشت کرتے آ رہے تھے۔ دوپہر اپنے عروج پر تھی۔ بازار کی رونق مٹتی جا رہی تھی۔ ریستورانوں میں ابھی رش چل رہا تھا۔ ہم سڑک سے کھڑے دیکھ رہے تھے۔ چھجّوں اور کمروں میں خوش پوشاک لوگ بیٹھے، دونوں ہاتھوں سے کھانا سمیٹ سمیٹ کر اپنے اندر ٹھونس رہے تھے۔ ہم ندیدوں کی طرح انھیں دیکھتے رہے، پھر اپنی اس کمینگی پر خود ہی شرمندہ ہوتے ہوئے ایسی جگہ پر جا کھڑے ہوئے، جہاں سڑک کے ایک طرف دکانیں تھیں، اور دوسری طرف کمر تک بلند لوہے کے موٹے موٹے پائپوں کی ریلنگ لگی تھی، تاکہ کوئی راہ گیر نیچے نہ گر جائے۔ کوئی چالیس فٹ نیچے سنیما تھا، جس میں ناظرین کا ایک انبوہِ کثیر پہلے شو کے ختم اور دوسرے کے شروع ہونے کے انتظار میں جمع تھا، جسے ہم ساتوں ریلنگ کا سہارا لیے کھڑے دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ مجمع، جیسے کہ پانی کی طرح بلکورے لیتا، مچل رہا تھا۔ لوگوں کی آپس میں باتیں کرنے کی ایک گھناؤنی بلند بھنبھناہٹ، اس گڑھے میں سے اٹھتی، ہمارے کانوں میں کراہت پیدا کرتی، ایسے مستقل امڈی آ رہی تھی جیسے ابلتے پانی کے بڑے کڑاھے میں سے بھاپ کے بل کھاتے بادل اٹھ رہے ہوں۔ انسانوں کے اتنے بڑے مجمع کا اپنا ایک کردار ہوتا ہے، جو جنگل سے نئے نئے پکڑ کے لائے ہوئے وحشی جانور سے بہت کچھ مشابہ ہوتا ہے، کیونکہ دونوں کے ردِعمل کے بارے میں کوئی تخمینہ لگانا ممکن نہیں ہوتا، کیا خبر وہ ذرا سی بات پر بدک کے بھاگ اٹھے، یا بھڑک کے حملہ آور ہو جائے۔ وہ خود بےچینی، کرب اور سب سے زیادہ خوف زدگی کی کیفیت میں ہوتا ہے، اور دیکھنے والوں کے دلوں میں گھٹن اور تنگی کے علاوہ ایک عجیب مبہم سے خوف و ہراس کی لہر دوڑا دیتا ہے۔ یہ سب وارداتیں ہم پر گزر رہی تھیں، لیکن اس تماشے میں کچھ ایسی دلکشی تھی کہ ہم چاہنے کے باوجود وہاں سے ہٹ نہیں رہے تھے۔ شو کیا ختم ہوا، وہاں بڑبونگ مچ گئی۔ نیچے سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ شو دیکھ کر نکلنے والے، ایک سست رَو نالے کی طرح ہجوم میں رواں، آہستہ آہستہ

پر چل پڑے۔

ہمارے قدم نادانستہ ریستوراں کے سامنے آ کر رک گئے۔ رش چھٹ چکا تھا۔ بیشتر میزیں خالی پڑی تھیں۔ سڑک پر اب مختلف کھانوں کی اشتہا انگیز لپٹوں کی بجائے جھوٹی پلیٹوں سے اڑنے والی باسی کھانے کی بُو تیر رہی تھی۔ بھوک بھی لگ لگ کر ماند پڑ چکی تھی، لیکن بیزاری اور چبھتی ہوئی نقاہت آمیز تھکن اندر اعضا پر جمتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

خچر بولا، "یار بڑے زور کا پیشاب لگا ہے۔ کیا کروں؟"

بوم نے کہا،

"کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند
کس کی حاجت روا کرے کوئی"

"اوئے یار میں پیشاب سے مر رہا ہوں اور تو مجھے شعر سنا رہا ہے۔"

بوم ہنسا۔ چوزے کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔ فیزنٹ نے کہا، "جس جس کو پیشاب آیا ہے، وہ ریستوران میں جا کر ضرورت پوری کر لے لیکن باری باری، سب اکٹھے چلاّ نہ بول دینا۔" ایسا ہی کیا گیا۔ آخر میں فیزنٹ گیا۔ لیکن وہ جو گیا تو اس نے واپس آنے کا نام ہی نہ لیا۔ آخر تھک کر چوزے سے کہا گیا کہ تو اندر دیکھ کے آ۔ اس نے آ کر بتایا کہ وہ ایک بڑی بڑی مونچھوں والے موٹے سے آدمی کے ساتھ میز پر بیٹھا چائے پی رہا ہے اور پیٹیز اڑا رہا ہے۔ ہمارے بھوکے پیٹوں سے ایک ہُوک اٹھی جو آسمان تک پہنچی۔ تھوڑی دیر میں وہ اندر سے ایک ڈبّے میں بارہ پیٹیز لے کر باہر نکلا اور بتایا کہ "وہ شخص میرا رشتے دار ہے اور پورے سیزن کے لیے ایک بنگلہ کرایہ پر لے کر یہاں قیام پذیر ہے۔ وہ مُصر ہے کہ میں رات اس کے پاس ٹھہروں۔ اس نے چند دوستوں کی تواضع کے لیے مجرے کا انتظام کیا ہے۔ سعیدہ اور جمیلہ پہنچ چکی ہیں۔ وہسکی عاموں عام ہو گی۔ تمھیں پتا ہے نا کہ جمیلہ کی نتھ بھی اسی نےکھولی تھی۔ میں کل صبح وہاں کیمپ میں واپس پہنچ جاؤں گا۔ تم لوگ برا نہ ماننا۔ اور ہاں! شام کی رونق دیکھ کر واپس لوٹنا۔" یہ کہتے ہوئے وہ تیزی سے واپس اندر چلا گیا۔ ہم نے جھٹاجھٹ ڈبّا کھول کے دو دو پیٹیز ہاتھوں میں لے کر وہیں کھانی شروع کر دیں۔ ان سے پیٹ تو کیا بھرتا، لیکن وہ چند لقمے مزا دے گئے۔ تھکن اور بیزاری اتنی تھی کہ کسی میں فیزنٹ کی بےوفائی پر ناراض ہونے کی ہمّت نہ تھی، اور اگر کسی میں کچھ تھی تو اس کی کمر ان دو پیٹیز نے اندر جا کر توڑ کے رکھ دی۔ زاغ کے منہ سے البتّہ ایک مرتبہ "کمینہ" کا لفظ نکلا پھر وہ بھی خاموش ہو گیا۔ بار بار سامنے آنے والا سوال پھر سامنے تھا کہ کہاں جائیں اور کیا کریں۔ واپس کیمپ چلے جائیں؟ اس خیال سے دل سُبکی اور شدید شکست کے احساس سے گھبرا اٹھتا۔ یہ پُررونق قصبہ، یہ تماشِ جاہ و زر کا مرکز جو امرا کو پورا پورا گرمی کا موسم اپنی آغوشِ عافیت میں سنبھالے رہتا ہے، ہمیں چند گھنٹے نہیں سہار سکتا اور باہر دھکیل دینے پر تلا بیٹھا ہے۔ ہمیں ضد ہے کہ واپس نہیں جائیں گے اور اس کی حسین شام کو، جس کی اتنی شہرت ہے، ہم بھی بےنقاب دیکھ کر رہیں گے۔ فیصلہ ہوا کہ صبح جہاں سے سیڑھیاں چڑھ کر سڑک پہ پہنچے تھے، وہاں درختوں تلے گھاس کے میدان میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ شام ہوگی تو پھر یہاں آ جائیں گے، محوِ خرام حسینوں کے چہرے دیکھنے۔ چتر

Scanned with CamScanner

مسلسل خرخیسے سے چپکا اور منہ اس کے کان سے لگائے بولے جا رہا تھا۔ خچّر، چوزہ اور بوم برابر برابر چل رہے تھے۔ زاغ کبھی ان کے ساتھ آ ملتا، کبھی سڑک کے دوسرے کنارے چلنے لگتا۔ چتر اور خرخیسے کسی کو قریب پھٹکنے نہیں دے رہے تھے۔ ہم سب کے دل فیزنٹ کی اس خوش نصیبی پر حسد سے سلگ اٹھے تھے۔ دھڑ دھڑ جلنے کی طاقت ان میں تھکن، بھوک اور بیزاری نے باقی نہ چھوڑی تھی۔

ہم سب نے سعیدہ اور جمیلہ کو اسی سال محرم کی سات تاریخ شام میں جھولے کے جلوس میں دیکھا تھا۔ شہر کے ایک دروازے کے باہر جلوس ڈھلوان پہ کھلی جگہ میں کھڑا تھا۔ اس روز تانگوں کا اڈّا وہاں سے ہٹا دیا گیا تھا۔ لوگ بند دکانوں کے تختوں پر، چھتوں پر، چوباروں کی کھڑکیوں میں امڈے پڑ رہے تھے۔ انتہی جوانی کی کوئی تیس چالیس لڑکیاں بڑا سا دائرہ باندھے کھڑی درد بھری سُریلی آوازوں میں مرثیہ خوانی کر رہی تھیں۔ ٹیپ کا مصرعہ آتا تو وہ اس کی لے پر، بازو ہوا میں بلند کر کے، ہاتھ زور سے چھاتی پر مار کر ماتم کرتیں۔ سیاہ لباس میں ان کے سنہرے بدن ایسی ڈلک مارتے تھے کہ ہم بت بن کر رہ گئے۔ ان کے پیچھے ڈھلتی عمر کی ان کی مائیں اور خالائیں مرثیہ خوانی میں آواز لگا کر ان کا ساتھ دے رہی تھیں۔ ان کے پیچھے صحت مند، ہٹےکٹے لڑکے کالے کُرتے پہنے نہایت مستعد، چوکس، ڈنڈے کھڑے تھے، اور کیا مجال کوئی شخص ان کا حلقہ توڑ کر آگے بڑھ سکے۔ کوئی شرارتی چھوکرا زیادہ ہٹ دھرمی دکھاتا تو ایسی مرمّت کرتے کہ اسے بھاگتے ہی بنتی۔ ان لڑکیوں کے چہرے ایسے تھے کہ جس پر بھی نگاہ پڑتی وہیں جم کر رہ جاتی۔ گردن اور چھاتی کے بیچ کھلے سیاہ گریبانوں کے درمیان ماتم سے سرخ ہوتی چھاتی کا کھلا گلاب ویسے تو بہت دلکش لگتا، لیکن جب بےدردی سے ماتم کرتے ہوئے پھر وہیں ہاتھ کی چوٹ پڑتی تو ترس آتا، اور اپنے دل پر چوٹ پڑتی محسوس ہوتی۔ جی چاہتا کہ کاش یہ اب اور ماتم نہ کریں۔ جمیلہ کے لمبے اور خوب سرخ ہوتے بال بکھرے تھے۔ اس کے سنہرے چہرے پر بالکل بالوں کی ہی سی رنگت کے بہت سے سرخ سرخ تِل تھے۔ بونا سا قد اور رس بھری شربتی سی آنکھیں۔ اس کے برابر سعیدہ کھڑی تھی؛ سیاہ بال، سیاہ مست آنکھیں، دراز قد اور صاف کُھلتا ہوا گندمی رنگ۔ بوم اور چتر جو نئے نئے مہاجر ہو کر آئے تھے، ایک اشتیاقِ بےاختیار کے عالم میں پوچھ رہے تھے کہ یہ کون لوگ ہیں جن کا جلوس ہے۔ بتایا گیا کہ کنجریوں کا جلوس ہے۔ حیرت و استعجاب سے انھوں نے پھر پوچھا کہ کیا یہ دو معصوم صورت حسن کی دیویاں جو سب کی نگاہوں کا مرکز ہیں، یہ بھی کنجریاں ہیں؟ انہیں مطلع کیا گیا کہ یہ دونوں بھی کنجریاں ہیں، اور بہنیں ہیں۔ بوم اور چتر کو ان کے نام کے ساتھ ذہن میں بھی کنجری کا لفظ شامل کرتے تکلیف ہوتی۔ بوم اور چتر نے پوچھا، "آپ سب ان کو اتنا مفصّل طور پر کیوں کر جانتے ہیں؟"

"ارے واہ انہیں کون شہر میں نہیں جانتا۔ بچہ بچہ ان کے نام اور صورت سے واقف ہے۔ اتنی خوبصورت اور اتنا اچھا گانے اور ناچنے والیاں ہیں، لوگ کیوں نہیں جانیں گے۔ اور پھر گانا سننے میں بھلا کوئی عیب ہے؟ شہر کا ہر بڑا آدمی کسی نہ کسی طوائف کو داشتہ رکھتا ہے۔ ورنہ وہ بڑا کاہے کا ہے؟ اس علاقے کا کون زمیندار ہے جس کا چکلے میں اپنا ڈیرہ نہیں ہے۔ وہ جب شہر

آتا ہے تو اپنے ڈیرے پر کسی نہ کسی گانے والی کو بلا کر اپنے دوستوں اور مصاحبوں سمیت گانا سنتا ہے۔ جب تک شہر میں ٹھہرتا ہے، ہر شام ایسی محفل برپا ہوتی ہے۔ شراب کا دور چلتا ہے۔ روپیہ ختم ہوتا ہے تو ڈیرہ چوکیدار کے سپرد کر کے مزید روپے کا انتظام کرنے اپنی زمینداری کو لوٹ جاتا ہے اور چوکیدار بھنک گھونگھنے میں لگ جاتا ہے۔ غریب غربا کے ہاں شادیوں پر ناچ گانا نہ ہو تو نہ ہو، باقی تو سب شادی پر ناچ گانے کا انتظام کرتے ہیں۔ اس جلوس میں ایک لمبی سانولی سی عورت تھی جو پہلے مرثیے کا بول اٹھاتی، اور پھر سعیدہ اور جمیلہ ایک ایک مصرعہ لگاتیں۔ اس کا نام بدرو بتایا گیا۔ کچھ عرصے بعد خرخیسے کے کسی چچیر یا ممیر کی شادی تھی۔ وہ ہمیں اپنے گاؤں لے گیا۔ دوپہر کو ہم نے قورمہ اور تندور کی روٹیاں کھائیں۔ پھر ایک بہت بڑے پھیلاؤ والے برگد کے نیچے دولہا کی سہرا بندی ہوئی۔ چارپائیوں پر طرّے باندھے، حقّہ چوستے، کوئی سو کے قریب آدمی بیٹھے تھے، جن میں سے ہر ایک نے سہرا بندی پر سو سو اور دو دو سو روپے سلامی دی۔ ساتھ میراثی کھڑا ایک کان پہ ہاتھ رکھ کر بانگ دینے کے انداز میں سلامی دینے والے کا نام اور رقم پکارتا۔ چارپائیوں کے آگے کچھ صفیں بچھی تھیں، ان پر اور اِدھر اُدھر خالی زمین پر مزارعے، کمّی اور غریب لوگ، بچے بالے اپنے میلے غلیظ چیتھڑوں میں نیم ننگے بیٹھےٹ زرداروں کے اس اظہارِ زر کے کھیل کو خاموش دلچسپی اور ایک گونہ لاتعلّقی سے بیٹھے دیکھ رہے تھے۔ یہ ہو چکا تو بدرو مع اپنے سازندوں کے بلائی گئی۔ اس طائفے کو جگہ دینے کے لیے صفوں میں بیٹھے لوگ اٹھا کر پیچھے دھکیل دیے گئے، حتیٰ کہ ان میں سے بیشتر چلچلاتی دھوپ میں مجبوراً جا کھڑے ہوئے۔ چونکہ بدرو کے مجرا کرنے کی شہرت اردگرد کے دیہاتوں میں بھی پہلے سے ہو چکی تھی، اس لیے دیکھتے دیکھتے ہزاروں کا مجمع اس تیز دھوپ اور حبس میں بدرو کو سننے کے لیے اکٹھا ہو گیا۔ اس نے پہلے سہرا گایا، چارپائیوں پہ بیٹھے مہمان زمینداروں نے مقابلے میں اور دولہے اور اس کے خاندان والوں سے اپنے اپنے تعلق کو دوسروں سے زیادہ گہرا اور مضبوط ثابت کرنے کے لیے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ویلیں دیں۔ عام لوگ دوستی کے نیلام کے مظاہرے کو بھی اسی سلامی والی لاتعلقی اور خاموشی سے دیکھتے رہے۔ سہرا ختم ہوا تو ہر طرف سے فرمائش بلند ہوئی، "کافی گاؤ"۔ اس نے آواز اٹھائی

کنجری بَنیاں میری عزت نہ گھٹدی
میکو نچ کے یار مَناوَن دے

آواز ایسی بلند، کھلی اور نکھری ہوئی کہ دور دور تک ہر کان میں ایک ایک لفظ اور ایک ایک سُر پہنچے۔ لاؤڈسپیکر کس بلا کا نام ہوتا ہے۔ وہ آواز پکار پکار کے اعلان کر رہی تھی کہ لاؤڈسپیکر کا سہارا تو وہ لیتے ہیں، جنھیں راگ ودّیا پر پوری دسترس نہ ہو یا جنھیں آواز کا عیب چھپانا مقصود ہو۔ جونہی اس نے پہلی تان ختم کی تو اس ہزاروں کے ساکت و جامد مجمع کےحلق سے اکٹھی آہ بلند ہوئی، جو بیک وقت طمانیت، تشکر، آسودگی اور حصول لطف کا اعتراف، اور بدرو اور اس کے فن کے لیے داد تھی۔ مفلوک الحال، ننگے، بھوکے، دھول مٹی سے اٹے لوگ، جو دھوپ اور حبس میں کھڑے مر رہے تھے اور بظاہر اجڈ اور گنوار نظر آتے تھے، شعر اور سُر کے لیے اتنا ذوقِ لطیف رکھتے تھے، ہمارے لیے یہ بات انتہائی تعجب کا باعث بن رہی تھی۔ وہ

Scanned with CamScanner

بار بار فرمائش پر فرید کی کافیاں گاتی رہی، حتیٰ کہ دن ڈھل گیا، لیکن مجمع ویسے ہی سکتہ زدہ کھڑا تھا۔ ذرا دور ہٹ کے کچھ کوٹھوں کی چھتوں پر افلاس زدہ کسانوں سے بھی زیادہ مظلوم ایک مخلوق سرخ، نیلی کھدّر کی میلی رِداؤں میں لپٹی بیٹھی، دور ہی دور سے مردوں کی مقبوضہ دنیا میں سے اپنے حصے کی، جو پس خوردہ کی صورت میں ہوا میں بہکتی ہوئی ان تک پہنچ جاتی، ریزہ ریزہ خاموشی سے چن رہی تھی۔ صوت و آہنگ کی اس ضیافت پہ کسی ردِ عمل کے اظہار کا اختیار اس سے سلب شدہ تھا۔ انھی کی صنف کی ایک فرد، جو مردوں کے حقِ ملکیت سے بغاوت کر کے باہر نکل آئی تھی، بھرے مجمع میں کھڑی گا رہی تھی۔ اس کو وہ حیرت زدہ دیکھ رہی تھیں کہ عجیب بات ہے کہ اپنے باغی کی، جب وہ سارے بندھن توڑ کر آزادی کا نعرہ لگاتا ہوا سامنے آ کھڑا ہوا ہے تو، یہ بجائے سرکوبی کے اسی کے سحر میں مسحور ہو کر قید ہوا جاتا ہے۔ بات کا یہ پیچ ذرا کھل کے ان کی سمجھ میں آ جاتا تو وہیں کئی بدرو چھتوں سے نیچے "پڑ" میں آ کر کھڑی ہو جاتیں۔ شہر میں دستور ذرا مختلف تھا؛ بارات آدھی رات کے قریب لڑکی والوں کے گھر کے لیے چلتی۔ نکاح کے بعد جاہے کڑکڑاتا جاڑا ہو، لڑکی والے شکر کے شربت سے تواضع کرتے اور بارات الٹے پاؤں واپس آ جاتی۔ اس رات باراتیوں کا کھانا نہ لڑکے والے اور نہ لڑکی والے کھلاتے۔ ہر کوئی شمولیت سے پہلے گھر سے کھا کے آتا۔ دوسرے دن ولیمے کا کھانا مدعوئین کے گھروں پر نوکر، دائیاں پہنچاتیں۔ مجرے کا اہتمام لڑکے والے کرتے۔ بعض صورتوں میں تو دولہا اور اس کے سنگی ساتھی، اور دولہے کا باپ اور اس کے احباب، الگ الگ مجرے کی محفلیں جماتے تاکہ آزادی میں فرق نہ آئے، اور واقعی خوب کھل کھیلتے۔

کچھ دیر تو ہم دو گروہوں میں بٹے آگے پیچھے چلتے، میدان کی طرف بڑھتے رہے۔ پھر اکٹھے ہو کر چلنے لگے۔

چتر نے کہا، "یہ فلم، ندیا کے پار، بڑی زبردست ٹریجڈی ہے۔ دلیپ اور کامنی کوشل نے کمال کر دیا ہے۔ حالات کے ستائے ہوئے دو پریمی ایک دوسرے سے لپٹے، آنکھوں میں آنکھیں ڈالے، دوست دشمن کے سامنے طغیانی سے چڑھی ہوئی ندی کے گرداب میں پھنس کر کشتی سمیت غرق ہو جاتے ہیں۔"

چوزہ دفعتاً انہیں قدموں پر رک گیا۔ چتر اور بوم بھی ٹھہر گئے۔ چوزے کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ بڑی بڑی شربتی آنکھیں پوری کھلی خلا میں دیکھ رہی تھیں، جیسے بھیانک خواب سے ابھی ابھی چونکی ہوں۔ اس کے چہرے پر اور آنکھوں میں حسرت کی بےبسی پھیلی، تمنا کا کوندا لہرایا، خوف کی سیاہ پرچھائیاں چھائیں۔ چتر اور بوم اسے حیرت سے دیکھتے رہ گئے کہ اسے کیا ہو گیا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں تیزی سے لکھی جانے والی، اور اسی تیزی سے مٹنے والی الجھی الجھی تحریریں وہ پڑھنے سے قاصر تھے۔ بوم سے اس کی حالت دیکھی نہ جا رہی تھی۔ بےکل ہو کر پوچھا، "چوزے تم ٹھیک تو ہو؟ بات کیا ہے؟"

وہ ٹھہرے تو دوسرے، جو چند قدم آگے بڑھ گئے تھے، واپس پلٹ آئے۔

اس نے تیقّن اور اعتماد سے کہا، "مجھے بھی ایسی ہی حسین موت چاہیے! دوست دشمن کے

سامنے، محبوب کی آغوش میں!"

زاغ بولا، "آپ تو خود زمانے بھر کے محبوب ہیں۔ اللہ کی شان آپ کو بھی محبوب کی تلاش ہے!"

بوم نے تیز ہوتے ہوئے کہا، "بکواس مت کرو۔" چوزے نے بوم کا ہاتھ پکڑ کر اسے روکا، "کیوں بلاوجہ جھگڑتے ہو؟ کہنے دو جو کہتا ہے۔"

زاغ نے چوزے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، "بچے! بچ گیا تُو اس رات ٹرین میں! اس علاقے کے لوگ بڑے صاحبِ ذوق ہیں۔ مصری کی ڈلی کی طرح تجھے اٹھا کر منہ میں رکھ لیتے۔ لونڈے کا اغوا تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔"

خرِعیسےٰ نے کہا، "تُو خود اس وقت چوروں کی طرح الگ چھپا سو رہا تھا۔ تجھے اس سے کیا غرض کہ کیا ہوا، اور کیسے ہوا۔اب تُو نے اس طرح کی کوئی بات کی تو سمجھ لے بہت پچھتائے گا۔"

چتر نے کہا، "دیکھو بھئی اگر فیزنٹ چلا گیا ہے تو یہ مطلب نہیں کہ ہم پردیس میں ایک دوسرے کے سر پھوڑیں۔ خچّر! زاغ کو الگ لے جا!" وہ اسے بازو سے پکڑ کر سڑک کے دوسرے کنارے پر لے گیا۔ چتر ماحول میں کشیدگی کم کرنے کے لیے گویا ہوا، "میرے پاس کچھ گنجائش ہوتی تو آج میں یہ فلم تم سب کو دکھاتا۔ خیر! کوئی بات نہیں، واپس چل کے سہی۔"

بوم بولا، "چھوڑ یار تو نے اپنا تو جوتے میں کباڑا کرنا ہی تھا، ساتھ میں ہمارا بھی کر دیا۔ چوزہ اور میں تو سگریٹ سے بھی تنگ ہو کر رہ گئے ہیں۔"

چتر نے کہا، "کوئی بات ہی نہیں۔ بس ذرا، تھوڑا صبر! سب ٹھیک ہو جائے گا۔" پھر خرِعیسےٰ سے پُراعتماد لہجے میں کہا، "نکال یار پیکٹ، ان کو بھی ایک ایک پلا دیں، کیا یاد کریں گے۔" خرِعیسےٰ نے جیب سے پیکٹ نکال کر پہلے کھول کر دیکھا، اس میں چار سگریٹ بچے ہوئے تھے۔ وہ اس نے بوم کے حوالے کر دیا، اور اس نے قبول کر کے ایک سگریٹ بوم اور چوزے کو پیش کیا، اور یہ کہتے ہوئے دو جیب میں رکھ لیے، "پھر کام آئیں گے۔"

چتر نے گھاس پہ لیٹے خرِعیسےٰ سے پوچھا، "یار! یہ فیزنٹ نے جو بتایا تھا، کہ اس کے دوست نے جمیلہ کی نتھ کھولی تھی، اس کا کیا مطلب ہوا؟"

"تُو نہیں جانتا؟"

"نہیں!"

بوم نے کہا، "مجھے بھی علم نہیں کہ یہ نتھ کھولنا کیا ہوتا ہے۔"

"خیر! تیری بےعلمی تو سمجھ میں آتی ہے، آخر کو بوم ٹھہرا، لیکن حیرت ہے کہ چتر بھی نہیں جانتا۔ ویسے تو کہا جاتا ہے کہ یہ رسم ہندوستان کے ہر چکلے میں رائج ہے، لیکن ہمارے شہر میں اس کا کچھ زیادہ ہی چرچا رہتا ہے، اور تم دونوں یہاں نووارد ہو۔"

خرِعیسےٰ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ باقی سب اس کے قریب حلقہ باندھ کر بیٹھ گئے۔ وہ کہنے لگا، "لو سنو! کنجروں کے ہاں قاعدہ ہے کہ کئی کنواری لڑکیوں کی ناک میں کنوار پنے کے اعلان کے طور پر سونے کی تار گول کر کے ڈالی ہوتی ہے، جو نتھ کہلاتی ہے۔ ان کی بیٹی یا بہن جب تیرہ چودہ

Scanned with CamScanner

برس کی ہو جاتی ہے تو اس کا باپ، بھائی، پھوپھیاں یا اور وارث نتھ کھلائی کی تاریخ کا اعلان کرتے ہیں، اور اسے خوب مشتہر کرتے ہیں۔ اس پر بڑے بڑے زمیندار، سیٹھ، غرضیکہ علاقے کے صاحبِ حیثیت عیّاش و عشّاق، اس تاریخ کو ان کے گھر پر جمع ہوتے ہیں، اور لڑکی کی بولی شروع ہوتی ہے۔ وہ کنواریٹ زندگی میں پہلی مرتبہ، سب سے زیادہ بولی دینے والے مرد کی آشنا بنی، پہلی رات اس کے ساتھ گزارتی ہے۔ اور نتھ کھل جاتی ہے۔ تقریباً ہفتہ بھر یا کچھ ایسی ہی مدت کے لیے وہ دلھن بنی اس کے ساتھ اپنے گھر میں رہتی ہے۔ یوں سمجھ لو کہ یہ کنجروں کی ایک طرح کی شادی ہے۔ خوب جشن منایا جاتا ہے، دیگیں پکتی ہیں، کنجر برادری میں کھانا بٹتا ہے، لیکن نکاح نہیں پڑھایا جاتا، اور نہ ہی وہ عمر بھر کے لیے اس کی پابند ہوتی ہے۔ ان چند راتوں کے بعد نتھ کھولنے والے کا کھیل ختم اور پیسہ ہضم ہو جاتا ہے، اور وہ رنڈی بنی جس سے، جس قیمت پر، جب چاہے، تعلق کرنے کے لیے آزاد ہوتی ہے۔ البتّہ ایک وضع داری وہ لڑکی رنڈی بن کے بھی عمر بھر نبھاتی ہے کہ نتھ کھولنے والا جب بھی قیمت دے کر اسے بلانا چاہے، تو اس کا حق پر تماشیین کے مقابلے میں فائق گردانتے ہوئے انکار نہیں کرتی۔ فیزنٹ کے دوست کے کہنے پر جمیلہ جو اتنی دور سے بہن کو بھی ساتھ لے کر آ گئی ہے تو اس کی بڑی وجہ یہ بھی ہے۔"

چتر نے پوچھا، "فیزنٹ کے دوست نے جمیلہ کی کیا بولی لگائی ہو گی؟"

خرِعیسےٰ نے بتایا، "یہی کوئی دس پندرہ ہزار روپے۔"

چتر اور بوم حیرانی سے بولے، "دس پندرہ ہزار روپے؟"

"اور نہیں تو کیا؟ جمیلہ کی نتھ کھولنی کوئی معمولی بات ہے؟"

بوم نے کہا، "بڑا روپیہ ضائع کیا!"

"بھئی یہ تو اپنی اپنی گرہ اور طلب کی بات ہے۔"

چتر نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا، "جب کبھی میرے پاس دس پندرہ ہزار روپیہ ہوا تو میں جمیلہ کی دوبارہ نتھ کھولوں گا، اور اتنی ہی قیمت دے کر۔"

اس بڑے میدان میں آ کر بیٹھنے کی ایک وجہ سانولی لڑکی کو دوبارہ، بلکہ سہ بارہ دیکھنا بھی تھا۔ اس کی کھڑکی کو انھوں نے سوتے جاگتے برابر نگاہ میں رکھا، لیکن اس نے ایک بار بھی جھانک کر نہ دیا۔ بہت مایوس ہوئے، لیکن کیا زور تھا۔ اتنے میں وہاں ایک دم اندھیرا چھا گیا، جیسے گہری شام ہو گئی ہو۔ سب ہڑبڑا کر اٹھے، کپڑوں سے گھاس پھونس جھاڑی، کوٹ سنبھالے اور چل پڑے۔ چتر نے کہا، "گھبراؤ نہیں، یہ مکانوں میں گہری نیچی جگہ ہے اس لیے اندھیرا زیادہ گہرا لگ رہا ہے۔ پہاڑوں میں اندھیرا اجالا، دونوں، میدانوں میں اپنے سہج سہج اور برابر اترنے اور پھیلنے کے طریقے کی بجائے، یونہی دفعتاً بےربط اور بےہنگم طور پر پھیلا کرتے ہیں۔ بڑا بازار بلندی پر ہے، دیکھنا وہاں روشنی ہو گی۔ ہم تیزی سے سیڑھیاں چڑھتے اوپر پہنچے۔ وہاں واقعی کچھ اجالا تھا، اگرچہ دکانوں کے اندر بلب روشن ہو چکے تھے۔ چتر نے کہا، "بھائی لوگو، میں اور خرِعیسےٰ ذرا ایک دوست سے ملنے جا رہے ہیں۔ تم بازار کی سیر کرو۔ بس ایک یا زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے میں واپس آ جائیں گے۔" چتر نے اتنا کہا، اور وہ دونوں پلٹے اور الٹے رخ پر چل دیے۔ چتر جو دو دنوں سے خرِعیسےٰ کے کانوں میں پھونکیں مار رہا تھا، اس کا کوئی نتیجہ تو برآمد ہونا

تھا۔ رونق اپنے عروج پر تھی۔ بوم، چوزہ، زاغ اور خچر خالی خالی نظروں سے بازار کی گہما گہمی دیکھتے آگے آگے چلتے جا رہے تھے۔ بھوک کی آگ، جو دن بھر سلگتی بھڑکتی رہی تھی، اب پھر ان کے پیٹوں میں بھڑک اٹھی تھی۔ شام خوب سہانی اور ٹھنڈی تھی۔ مزے کی ہوا چل رہی تھی۔ بازار میں اندھیرا اترا آ رہا تھا۔ بتّیاں روشن ہوتی جا رہی تھیں۔ آسمان کا جو حصہ نظر آ رہا تھا، روشن تھا، اور اس پر آوارہ سلیٹی بادلوں کے ٹکڑے، سرخ، سنہری روشنیوں میں نہائے، تیر رہے تھے۔ رنگین قبا آنچل لہراتے، خوشبو کے مرغولے اڑاتے، کھلے منہ، ننگے سر، ہنستے، کلیلیں کرتے اتنے قریب سے گزر رہے تھے کہ کندھے بھڑ بھڑ جاتے۔ ہم اس چہل پہل کا حصہ تو بنے ہوئے تھے، لیکن اس کا حصہ نہ تھے۔ سرخوشی، جوش اور کھلنڈرے پن کی بجائے، ہم نہایت بجھے بجھے، بیزار اور اداس تھے۔ ہم نے اپنے سکتہ زدہ پتھر ذہنوں میں اس جذبے کی تلاش کی، جو پردوں میں لپٹے ٹانگے کے اندر ایک موہوم سائے کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے چلچلاتی دھوپ میں میل یا میل تک سائیکل چلانے پر مجبور کر دیتا تھا۔ اس کی وہاں کوسوں تک کوئی خبر نہ تھی۔ بازار ختم ہوا تو ساتھ ہی رونق ختم ہو گئی۔ سڑک کے دونوں طرف درختوں کے سیاہ ہیولوں میں آسیب زدہ بنگلے جان چھپائے کھڑے تھے۔ ان کے اندر کسی زندہ بشر کے موجود ہونے کے کوئی آثار نہ تھے۔ گویا سُونے پن کا آدم خور دیو ان کی بو پا کر آیا، اور سب کو کھا گیا۔ ادھر ادھر کہیں کوئی آفت کا مارا بلب روشنی دے رہا تھا۔ سڑک کے کنارے دور دور کھڑے کھمبے بھی اسی دیو کے سحر تلے آئے معلوم ہوتے تھے۔ نیلی نیلی دھند اور سیاہ اندھیرے میں پھنسی روشنی وہیں اوپر کہیں ٹنگی رہ جاتی تھی۔ ہم دوپہر والے ویرانے میں پھر پہنچ گئے۔ اب سامنے پہاڑوں کی بجائے اونچے اونچے سایوں کا شائبہ گزرتا۔ نیچے وادی میں ایک جگنو چمک رہا تھا۔ کسی گھر کا دیا ہو گا۔ بوم نے کہا، "ہم دنیا اور وقت کے آخری کونے پر پہنچ گئے ہیں۔ آؤ اب واپس چلیں۔"

چوزے نے حیرت سے پوچھا، "واپس چلیں؟ چھوڑو واپس کیا جانا ہے۔اس کرۂ ارضی اور وقت دونوں سے آگے نکل چلتے ہیں۔ اتنے بہت سے برسوں سے اس جہانِ آب و گِل میں وقت کے غلام بنے زندہ ہیں۔ پچھلے سترہ برسوں سے وہی ایک وظیفہ، کہ سانس لیتے رہو، کھاؤ پیو، سو جاؤ، میں تو اس بےکار تواتر سے اکتا چکا ہوں۔ تم نہیں اکتائے؟ اب دیکھنا چاہیے کہ وقت کے بعد اور اس کرۂ ارضی سے آگے کیا ہے۔" بوم نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا اور چپ کا چپ رہ گیا۔

خچّر نے پوچھا، "خیمے میں کھانا پکا رکھا ہو گا؟"

زاغ نے کہا، "ہونا تو چاہیے، فلک شیر کو کہہ کر تو آئے تھے۔"

خچّر نے کہا، "آہا، جلد ہم اپنے خیمے میں بیٹھے گرم گرم روٹیاں کھا رہے ہوں گے۔" یہ سن کر سبھی کو ایک تشفّی سی محسوس ہوئی۔ زاغ بولا، "یہ چتر کل سے خرِعیسےٰ کو کوئی چکر دینے کی فکر میں ہے۔ پتا نہیں اس موٹی مرغی کو پھانس کر کہاں لے گیا۔ بڑا حرامی ہے۔ کہیں اسے چھری نہ پھیر دے۔"

خچّر بولا، "وہ بھی کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں، اور پھر چھوٹی موٹی چوٹ سے اسے فرق بھی کیا پڑے گا۔"

زاغ نے کہا، "واپس آ جائیں تو ابھی سارا راز کھل کر سامنے آ جائے گا۔"

Scanned with CamScanner

جہاں سے کھمبے شروع ہوتے تھے، واپسی پر وہاں تک پہنچے تو وہی گندمی رنگ والی لڑکی اسی سہیلی کے ساتھ سامنے سے تیز تیز قدم اٹھاتی، ہمارے برابر سے گزر کر آگے نکل گئی۔ سب کو مسرت آمیز حیرت ہوئی کہ یہ اتنی دور کہاں گھوم رہی ہیں۔ ایک دم خون کی گردش تیز ہو گئی، جیسے چھپکلی کے خون کی گردش پتنگے کو دیکھ کر تیز ہوتی ہو گی۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پہلے سے سست قدم رک گئے۔ وہی دوپہر والی لڑکیاں تھیں، بلکہ کالی کو تو صبح بھی کھڑکی میں بال بناتے دیکھا تھا۔ بوم نے کہا، "تم لوگ اس قدر حیران کیوں ہوتے ہو؟ بس سیر کرتی یہاں تک چلی آئیں۔ یہ کوئی تمہارا پیچھا کرتی ہوئی تھوڑا ہی آئی ہیں۔"

زاغ نے سانس پھلاتے ہوئے کہا، "ان سے بات کرنی چاہیے، یہ کالی پھنسو پھنسو ہے۔"

بوم نے کہا، "جوتے کھانے کا شوق ہے تو بسم اللہ کیجیے۔"

چوزہ گھبرایا، "یار ہمیں تو اس قصبے سے بھاگنے کا راستا بھی معلوم نہیں۔ صبح سے ایک ہی سڑک پر گھوم رہے ہیں اور اسی کو جانتے ہیں۔ خدارا کوئی پھڈا نہ کھڑا کر لینا۔ ابھی چند روز اور ہمیں اسی قصبے میں گھومنا ہے۔"

اتنے میں پھر وہی لڑکیاں سڑک کے پرلے کنارے لوٹ کر جاتی ہوئی گزریں۔ اب کے انہوں نے دوپٹے خوب احتیاط سے سر اور بدن پر لپیٹے ہوئے تھے، جیسے وہ دوپٹے ہماری سفلی نظروں کے خلاف ڈھال کا کام دے سکتے ہیں۔ ہم پہلے سڑک کے درمیان میں پہنچے، پھر ان کے نزدیک ہوتے ہوتے بالکل قریب پہنچ گئے، اتنے کہ ایک دوسرے کی پھولی ہوئی سانسوں کی آواز تک سنائی دینے لگی۔ زاغ نے ایک لمبی آہ کھینچی، خاص طور پر انہیں سنانے کے لیے، جیسے جانور جگالی کرتے ہوئے ایک لقمہ نگل کے دوسرا معدے سے منہ میں لاتے وقت زور سے سانس لیتا ہے۔ زاغ اور خچر ان سے ذرا آگے نکلے، اور پلٹ کے عین ان کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ وہ ٹھٹھک کر رک گئیں۔ بوم اور چوزے میں رکنے کی جرأت نہ تھی۔ وہ پلٹ کے دیکھے بغیر آن جان بنے آگے چلتے گئے۔ زاغ انہیں کہہ رہا تھا، "ہماری بس اتنی التجا ہے کہ ہم پردیسی ہیں، اداس ہیں، اور دکھ کے مارے ہوئے ہیں! آپ چند منٹوں کے لیے یہاں بیٹھ کر ہمارے ساتھ باتیں کریں گی تو ہمارے آزردہ دل بہل جائیں گے۔"

کالی نے کہا، "آپ ہمارا راستا چھوڑ دیں۔"

زاغ نے کہا، "ہم نے آپ کا راستا کہاں روکا ہے۔ اتنی بڑی سڑک خالی پڑی ہے۔"

سہیلی بولی، "جوجی کس عذاب میں پھنسا دیا تم نے۔ کہا بھی تھا اتنی دور نہیں جاتے۔"

جوجی ذرا تنک کر بولی، "آپ زیادہ چالاک نہ بنیں اور ہماری راہ چھوڑ دیں ورنہ ۔"

"ورنہ کیا ہو گا؟"

"توبہ ہے بابا، ورنہ ہم شور مچائیں گی۔"

پسینے میں شرابور خچر دم بخود کھڑا کانپ رہا تھا، اور ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہا تھا۔ اسے کچھ کہنے کو نہ تو سوجھ رہا تھا اور نہ ہمت ہی تھی۔

زاغ بولا، "آپ تو ایسے ہی ناراض ہو رہی ہیں۔ ہماری تو ایک معصوم سی التجا ہے کہ دم بھر کے لیے یہاں ہمارے پاس بیٹھ جائیں، اس میں شور مچانے کی کیا بات ہے؟"

جوجی نے کہا، "ہمارے پاس وقت نہیں۔" اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی چھڑی تھی۔ اس چھڑی سمیت ہاتھ لمبا کر کے دونوں کے سامنے کیا اور کہا، "چلو سیمی۔" انہوں نے ادب سے راستا چھوڑ دیا۔ چھوٹی موٹی سی بنی سیمی، اس کی پناہ میں آگے بڑھی، اور وہ دونوں تیز قدموں سے سڑک پر چلنے لگیں۔

زاغ نے آگے بڑھ کر پھر ان کا راستا روک دیا، "کل یہیں اسی وقت ملنے کا وعدہ کریں۔"

"کیوں وعدہ کریں؟"

"خدارا ہم پر رحم کریں، نہیں تو تنہائی ہمیں کھا جائے گی۔" زاغ ہاتھ باندھے کہہ رہا تھا۔

وہ ہنس دیں۔ جوجی بولی،

"کیا کر رہے ہیں آپ؟ سامنے سے لوگ آ رہے ہیں۔" زاغ فوراً ہٹ گیا۔

ان کے پیچھے پیچھے ذرا فاصلے سے زاغ اور خچّر سینہ پھلائے، مستی اور سرور کے عالم میں سڑک سے ایک ایک فٹ اونچے چل رہے تھے۔ کہاں کی بھوک اور کیسی تھکن، یہ تو مادی انسانوں کی مصیبتیں ہوتی ہیں۔ جوجی اور سیمی نے انہیں ایک بار پلٹ کر دیکھا، اور مسکرا دیں۔ جیسے کہہ رہی ہوں،

اڑن کھٹولے پہ اڑ جاؤں
تیرے ہاتھ نہ آؤں

جب وہ دونوں بازار میں واپس پہنچے تو بوم اور چوزہ ریلنگ کے سہارے اکتائے کھڑے سینما بینوں کا تماشا دیکھ رہے تھے، اور چنے پھانک رہے تھے۔ پہاڑ کی نم آلود ہوا نے نہ تو چنوں کا اصل ذائقہ اور مہک رہنے دی تھی، اور نہ ہی ان میں خستہ پن باقی چھوڑا تھا۔ بھوک کے باوجود وہ زیادہ نہ کھا سکے۔ خوشی سے ابلتے ہوئے خچّر اور زاغ نے آ کر پہلے ان سے ہاتھ ملائے اور پھر بےاختیار ہو کر معانقہ کیا۔ زاغ نے پوچھا، "کیا کھا رہے ہو؟" بوم نے کہا، "چنے، مگر اچھے نہیں۔ لو دیکھو۔" زاغ نے لفافہ لے کر نیچے سینما کے صحن میں پھینک دیا۔ "لعنت بھیجو چنوں پر، یہ بھی کوئی کھانے کی چیز ہیں۔ چڑیا گھر کے بندروں کی خوراک۔ تم یہیں ٹھہرو، میں اور خچّر ذرا جوجی اور سیمی کو گھر تک پہنچا کے آتے ہیں۔ اکیلی لڑکیاں ہیں نا، کوئی راستے میں تنگ نہ کرے۔ واپسی پر تمہارے لیے پھل اور پیٹیز لے کر آئیں گے۔ چلو خچّر۔" یہ کہہ کر وہ چل دیا۔ بوم اور چوزہ ہکابکا رہ گئے۔ بوم نے چلے جاتے خچر سے پوچھا، "کیسا رہا؟" اس نے عنابی جبڑوں میں جڑے سفید مضبوط دانت نکالتے ہوئے کہا، "زبردست معرکہ رہا۔ آ کر بتاتا ہوں۔"

چوزے نے پوچھا، "بوم، پیسوں کی کیا پوزیشن ہے؟"

"چتر نے تو ابھی تک کچھ واپس نہیں دیا۔ اس نے فیزنٹ سے بھی بیس روپے ہمارے سامنے قرض لیے تھے، ان میں سے تین چار روپے ہار گیا ہو گا۔ اس طرح سولہ روپے تو اس کے پاس تھے۔ چاہتا تو ہمارے دس روپے واپس کر سکتا تھا، مگر نہیں کیے۔ جب مانگتا ہوں کہتا ہے، کہیں بھاگا جا رہا ہوں! جب تمہارے ختم ہو جائیں گے، لے لینا۔"

چوزے نے مایوسی سے کہا، "وہ تو نہیں دے گا۔"

Scanned with CamScanner

بوم بتانے لگا، "تیس روپوں میں سے اب میرے پاس کوئی اٹھارہ روپے چھ آنے رہ گئے ہیں۔" پھر پیکٹ نکال کر سگریٹ گئے اور گویا ہوا، "یہ چار سگریٹ ہیں۔ اب یہاں سے نیا پیکٹ بھی خریدنا ضروری ہو گیا۔ یوں سمجھو کہ باقی سترہ روپے بارہ آنے بچے ہیں۔"

چوزہ بولا، "واپسی پر کیا خرچ اٹھے گا؟ ریل کا تو سات آدمیوں کا واپسی رعایتی ٹکٹ لینے لے لیے ہم نے اپنی اپنی پرانی کتابیں بیچ کر حصہ ڈالا تھا۔ لیکن اب بس کا کرایہ تو دینا ہو گا۔ کتنا ہے وہ؟"

"بارہ بارہ آنے۔"

"ڈیڑھ روپیہ ہو گیا۔ باقی بچے سولہ روپے چار آنے۔ ابھی کھانے پینے کا خرچ، خیمے کا کرایہ وغیرہ دینا ہے۔ ابھی چار دن اور یہاں رہنا ہے۔ ان روپوں میں ہم دو آدمیوں کی گزر کیسے ہوگی؟ ہم تو سگریٹ بھی راشننگ سے پیتے ہیں۔ ایک ایک دوپہر میں خرعیسےٰ نے پلا دیا تھا۔ سفر میں ہونے کے باوجود پورے دن میں صرف تین تین پیے ہیں۔ ہم دراصل اپنے سے بہت زیادہ امیروں کی دنیا میں آ کر پھنس گئے ہیں۔"

بوم ذرا تیز ہوا، "یار کیسی باتیں کرتے ہو۔ یہ چتر، خچّر اور زاغ کون سے بھلا امیر ہیں؟ بزنٹ اور خرعیسےٰ تو خیر میں مانتا ہوں کہ دولت مند لوگ ہیں۔"

چوزہ کہنے لگا، " زاغ کا شمار رئیسوں میں تو نہیں ہوتا، لیکن دو تین سو روپے اپنی ذات پر خرچ کرنا اس کے لیے بھی کوئی مشکل نہیں۔ پانچ مربّع زمین کا اکیلا مالک ہے۔ باپ سر پہ نہیں، نہ جس سے مانگنے کی مصیبت ہو۔ ساری آمدن اس کے پاس ہوتی ہے۔ ماں کو جو چاہے بہانہ تراش کر سنا دے، وہ کون سی تفتیش کر سکتی ہے۔ سگریٹ وہ نہیں پیتا، شراب وہ نہیں پیتا۔ پھر تم جانتے ہو ہوشیار آدمی ہے، اور ہوشیار آدمی غریب نہیں ہو سکتا، وہ جب چاہے چکّر دے کر ادھر اُدھر سے پیسے مار لے۔ خیر البتہ ہمارے جیسا غریب ہے، لیکن ایک تو وہ جُوا جیتا ہے، اور دوسرے خوش قسمتی سے چتر سے اس کی کوئی گہری دوستی نہیں جو اس کے پانچ روپے لٹتے۔" اتنا کہہ کر چوزہ کچھ دیر تک گہری سوچ میں ڈوبا رہا، پھر ایک کرب بھری آواز میں کہنے لگا، "ہم اگر خرچ برداشت نہیں کر سکتے تھے تو ہمیں پہاڑ کی سیر پہ نہیں آنا چاہیے تھا۔ گھر والوں کو بےجا تنگ کر کے ان سے بیس بیس روپے اگلوائے اور خود بھی ذلیل خوار ہوئے۔ تمھیں تو پتا ہی ہے کہ میری سوتیلی ماں ہے۔ میں دس دن تک مسلسل باپ سے تقاضا کرتا رہا تو اس نے ماں سے چھپا کر یہ بیس روپے دیے، اور کہا، بیٹا بیس روپے بڑی رقم ہوتی ہے، تم نہیں جانتے کس مشکل سے دے رہا ہوں! تمھاری ماں زندہ ہوتی تو کبھی نہ دیتا، لیکن دل میں تمھیں انکار کرنے کا حوصلہ نہیں۔ میرا دل چاہا کہ روپے اسے واپس کر دوں، اور کہوں کہ پروگرام منسوخ ہو گیا ہے۔ پھر یہ سوچ کر وہ بیس دہکتے ہوئے انگارے میں نے جیب میں ڈال لیے کہ اتنا پروگرام بن چکنے کے بعد اب اگر میں نہیں جاتا تو دوستوں میں بہت تضحیک ہو گی۔" کہیں سے ایک دم ٹھنڈی تیز ہوا اٹھ کھڑی ہوئی۔ گرم کوٹ جو صبح سے مصیبت بنے ہمارے ایک بازو سے دوسرے بازو پہ منتقل ہو رہے تھے، ہم نے اس سردی کو غنیمت جانتے ہوئے جھٹ پہن لیے۔

چوزہ بتانے لگا، "اگر مجھے گھر میں رہتے دیکھو تو سمجھو کہ میں کوئی اجنبی مسافر ہوں،

جو چند دنوں کے لیے وہاں ٹھہرا دیا گیا ہوں۔ کھانا وقت پہ ملتا ہے، اور جو بھی گھر میں پکا اس میں سے اچھا اور وافر حصہ ملتا ہے۔ ماں کپڑے بھی دھو دیتی ہے، لیکن بات نہیں کرتے حتیٰ کہ نہ طعنہ و طنز کے طور پر، نہ شکوہ و شکایت کے واسطے سے۔ چاہے کچھ ہو جائے، میں کبھی کوئی کام نہ کہے گی۔ میں نے اپنے لیے اس کے چہرے پر نہ کسی امید کی وابستگی کا اظہار دیکھا نہ کسی مایوسی کے اندوہ کے آثار پائے۔ ایک مکمل مقاطع اور کلّی عدم تعلق کا رشتہ ہمارے مابین ایک پابندی سے برابر پچھلے بارہ تیرہ سال سے چل رہا ہے۔ ہم گھنٹوں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے رہتے ہیں، اپنی اپنی نفرتوں کے تالابوں میں غلطاں و پیچاں۔ وہ کبھی کوئی بول نہ بولی، اور میں خوشامد یا خدمت کے کسی وسیلے سے توجہ کا طلبگار نہیں ہوا۔ ہم دونوں شاید یہ گمان کرنے پر مجبور ہیں کہ دوسرا موجود تو کیا، سرے سے خلق ہی نہیں ہوا۔ اس اثنا میں اس کے چار بچے پیدا ہوئے، دو لڑکے دو لڑکیاں۔ اس نےانھیں اکیلے پالا ہے، یعنی مجھ سے کبھی نہ انھیں سنبھالنے یا دیکھنے کی فرمائش نہیں کی، اور نہ میں نے کسی خدمت کے لیے رضاکارانہ پیش کش کی۔ بچے اب بڑے ہیں۔ بڑا لڑکا ساتویں میں اور چھوٹا پانچویں جماعت میں پڑھتا ہے۔ ایک بہن پانچ سال کی ہے، ایک چار سال کی! لیکن ایک بات جو ماں بچوں میں مشترک ہے میرے لیے ان کے چہروں کے تاثرات ہیں، جو ان کی ماں، جب وہ اس کے شکم میں ہی ہوتے ہیں تب عین مین اپنے چہرے جیسی بےتوجہی کی چھاپ ان کے چہروں پر لگا دیتی ہے۔ میں چاہتا ہوں اس جہنم سے کہیں نکل بھاگوں! مگر کہاں نکل بھاگوں؟ اپنی بزدلی اور کمزوری سے یوں بندھا ہوں، جیسے وہ سامنے کھڑا پیڑ زندہ رہنے کی مجبوریوں کے باعث زمین سے بندھا ہے۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اس کا نرخرہ اوپر نیچے ہوا، جیسے آنسو پی رہا ہو۔ عجب تضاد تھا۔ گھر کےاندر بیگانگی کی یہ کیفیت اور گھر کے باہر، جس کا ذکر غالباً اس نے عمداً کرنا مناسب نہ جانا، اس کی صحبت کے طلبگاروں کی لمبی فہرست۔ نہ اندر رہا جا سکے اور نہ باہر طلبگاروں کے خوف سے نکلا جا سکے۔

اتنے میں چتر اور خرعیسےٰ بازار میں آتے دکھائی پڑے۔ چتر بہت خوش نظر آ رہا تھا، جب کہ خرعیسےٰ کچھ جھینپا جھینپا سا تھا۔ بازار میں چند لوگ جو ابھی تک گھوم رہے تھے، وہ آسمان پہ نگاہ ڈالتے جلدی جلدی اپنے اپنے ہوٹلوں اور گھروں کے راستوں پر ہو لیے۔ چتر ہنس تو پہلے سے رہا تھا، ان دونوں کے پاس پہنچتے پہنچتے ہنسی سے بےحال پیٹ پکڑ کر زمین پر بیٹھ گیا۔ خرعیسےٰ کے چہرے پہ خفّت اور ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ پھیلی تھی۔ کہنے لگا، "یہ ایسے بے فضول ہنسے جا رہا ہے۔"

چوزہ اور بوم وجہ جاننے کے لیے اشتیاق سے پوچھ رہے تھے، "چتر، بتاؤ تو سہی ہوا کیا؟"

چتر ہنسی کے دورے سے سنبھل کر کھڑا ہو گیا، ادھر اُدھر دیکھا کہ کوئی قریب تو نہیں، جب اطمینان کر لیا کہ کوئی پاس نہیں تو بولا، "یار وہسکی کا موسم ہو رہا ہے، پینی چاہیے۔" پھر کوٹ کی جیب سے ادّھا نکال کر کوٹ کے پلو کی اوٹ میں ڈھکن کھولا، تیزی سے ایک لمبا گھونٹ بھرا، بوتل کوٹ کے اندر بغل میں چھپاتے ہوئے کھانستے کھانستے پوچھا، "کوئی اور صاحب شوق

Scanned with CamScanner

کریں گے؟" سب نے جواب دیا، "نہیں"، تو اس نے ڈھکن لگا کر بوتل جیب میں رکھی، سگریٹ سلگایا اور کہا، "چلیں؟"

بوم نے کہا، "ابھی تو زاغ اور خچر کو آنا ہے۔ ہم پوچھ رہے تھے کہ کیا ہوا، اور تو کہہ رہا ہے چلیں۔ پہلے بتا کیا ہوا؟"

چتر نے خرعیسےٰ سے پوچھا، "بتا دوں انہیں؟ دیکھ لو، پھر ناراض نہ ہونا۔"

خرعیسےٰ نے ہنستے ہوئے کہا، "ہاں، بھونک بھونک، ذات کا ہو کتا اور بھونکے نہ، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"اچھا تو پھر میں شروع سے سناتا ہوں۔ ہمارے شہر میں اینگلوانڈینوں کی ایک بہت بڑی تعداد ریلوے میں ملازمت کرتی ہے۔ ان کا تمام تر ملنا برتنا، تعلق واسطہ، صرف آپس تک محدود ہوتا ہے۔ اپنے طبقے کے اندر مقیّد، وہ اس شہر میں یوں زندگی گزار رہے ہیں جیسے کسی بند ڈبّے کے اندر رہ رہے ہوں۔ ان میں سے ہر فرد منتظر ہے کہ ریٹائر ہو تو اپنے اہل خانہ کو لے کر بیک ہوم، یعنی انگلستان، پہنچ جائے۔ عام لوگوں سے رابطہ ضروریات کے تحت جتنا ان کے لیے ضروری ہو، بس اتنا ہی رکھتے ہیں۔ شہر والوں کو تو یہ بھی خبر نہیں کہ اس انگریز نما مخلوق کو اینگلوانڈین کہا جاتا ہے، اور وہ سینکڑوں کی تعداد میں ان کے ساتھ اسی شہر میں بستے ہیں۔ جو ان سے متعارف بھی ہیں، وہ بھی انہیں انگریز سمجھتے ہوئے سہمے سہمے، خائف سے، بچ کے الگ رہنے میں اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔ نتیجتاً ایک گروہ نے دوسرے سے تہذیبی طور پر قطعی کوئی تاثر قبول نہیں کیا۔ ان میں سے بیشتر اپنے خاندانوں کے ساتھ ریلوے کلب میں آتے ہیں۔ میرا بھائی چونکہ ریلوے کا افسر ہے، اس واسطے میں بھی ہر شام کلب میں جا گھستا ہوں۔ ریلوے میں اینگلوانڈین گارڈ ہے، مسٹر جیمز۔ ہیلن نامی اس کی ایک بھتیجی ہے۔ وہ لاہور اپنے خاوند کے ساتھ رہتی تھی، وہ وہاں ریلوے میں کوئی چھوٹا موٹا افسر تھا، اور ریل کے کسی حادثے میں مارا گیا۔ ہیلن بیوہ ہو کر، اپنے دو چھوٹے چھوٹے بچوں کو ساتھ لیے، یہاں جیمز کے پاس چلی آئی۔ چھ مہینے تک اس کے پاس رہی۔ اس اثنا میں میری اس سے دوستی ہو گئی ، بلکہ یوں کہو کہ لمبی دوستی ہو گئی، سمجھتے ہو نا؟ ریلوے کی طرف سے جب اسے اپنے خاوند کے مقاماجات ملے تو اس نے اپنی چھوٹی بہن اور ماں کے ساتھ مل کر یہاں اس پہاڑی قصبے میں ایک بنگلا کرائے پر لیا، اور گیسٹ ہاؤس چلانا شروع کر دیا، اور ساتھ میں انگریزی ناچ سکھانے کا اسکول کھول لیا۔ میرے ساتھ اس کی خط و کتابت تھی۔ میں نے آج خرعیسےٰ سے کہا کہ چلو تمہیں ان لوگوں سے ملاتا ہوں۔ اس کی چھوٹی بہن مارتھا سولہ سترہ سال کی ہے، اور ایسی خوبصورت کہ آدمی دیکھتا رہ جائے۔" اس پر خرعیسےٰ نے سر ہلا کر تصدیق کی اور کہا، "وہ بہت خوبصورت ہے۔ دودھ جیسا گورا رنگ، بھرا بھرا جسم، نیلی آنکھیں، ہائے کیا بات ہے اس کی۔ ہیلن تو سانولی ہے، مگر وہ تو میم لگتی ہے میم۔" چتر نے کہا، " میں نے راستے میں اسے سمجھا دیا تھا کہ تعارف تو میں کرا دوں گا، آگے تیری اپنی ہمت ہے۔ ہم جاتے ہوئے دو ادھے وہسکی کے لے گئے تھے۔ خالی ہاتھ جانا تو نامناسب تھا۔" بوم کی طرف دیکھ کر کہنے لگا، "مجھے یوں نہ گھورو - وہسکی کے چالیس روپے اسی نے خرچ کیے ہیں۔ بچوں کے لیے دو ٹافیوں کے پیکٹ میں اپنی گرہ سے لے گیا تھا۔ خیر!

تو ہم وہاں پہنچ گئے۔ ریسپشن پر ایک کلرک کھڑا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ ہیلن کو اطلاع کرو چتر آیا ہے۔ اطلاع پا کر وہ دوڑی ہوئی آئی اور ہمیں ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ میں نے ایک ادّ وہسکی کا اسے پیش کر دیا۔ میرا خیال ہے کہ کچھ زیادہ بڑا تحفہ ہو جاتا، اور اس کی عادت بگ جاتی۔" بوم بیچ میں بول پڑا، "حرامی تم نے دو خریدے ہی اس نیت سے تھے کہ ایک تم پی سکو ورنہ پوری بوتل خریدتے یا پھر ایک ہی ادّھا لیتے۔" چتر نے کہا، "چلو ایسے ہی سہی۔ اس میں بھ کیا خرابی ہے۔ اچھا تو میں بتا رہا تھا کہ پھر اس کی ماں اور مارتھا، ہیلن کے دونوں لڑکوں کو لیے آ گئیں۔ میں نے ان سے ہاتھ ملائے اور لڑکوں کو ایک ایک پیکٹ ٹافیوں کا دے دیا۔"

خرعیسےٰ بولا، "وہ لڑکے تو اس سے ایسے مانوس تھے جیسے یہی ان کا باپ ہو۔"

چتر نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا، "میں نے اس کا تینوں سے تعارف کرایا، میٹ مائی فرینڈ خرعیسےٰ۔ اس نے دیکھا کہ میں نے ان سے ہاتھ ملائے ہیں، تو چاہے تھا کہ تعارف کرانے پر یہ بھی ان سے ہاتھ ملا لیتا، مگر ہمارا یار دقیانوسی اور بزدل ہے، رنڈیوں سے خوب کھل کھیلتا ہے سلیقے کی شریف خواتین سے ملا تو حواس باختہ ہو گیا۔ ہاتھ ماتھے تک لے جا کر سلام کر کے بیٹھ گیا۔ مارتھا اس کے برابر صوفے پر بیٹھ گئی۔ ان کی ماں اندر چائے لینے چلی گئی۔ ہیلن نے اس سے پوچھا، ہائی دی وے، آر یو اے کرسچین؟ یہ کہنے لگا، نو نو، مسلم مسلم۔ میں ہنس پڑا۔ ہیلن پوچھنے لگی، وٹ از دی میٹر؟ میں نے کہا، اس کے نام کے معنی کا تمہیں پتا نہیں، میں بتاتا ہوں۔ معنی ہیں کرائسٹس ایس۔ مارتھا اور ہیلن دونوں ہنس دیں۔ ہیلن کہنے لگی، چتر، یو آر اے نائی بوائے۔ مسٹر کرائسٹ از اے جنٹلمین۔ بچے قالین پر کھیلنے لگے۔ میں اور ہیلن باتوں میں مصروف ہو گئے، لیکن یہ برابر میری نگاہوں میں تھا۔ یہ کانوں تک سرخ، منہ پُھلائے، مارتھا کے برابر سیدھا بیٹھا سامنے دیکھ رہا تھا، جیسے پتھر کا بت ہو۔ مارتھا نے بات چلانے کے لیے اخلاقاً پوچھا، مسٹر کرائسٹ، وٹ ڈو یو ڈو؟ اس نے رحم طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھا، اور فرمایا، میڈم، نو انگلش، سکول بوائے۔ مارتھا مسکرا کر خاموش ہو گئی۔ مجھے ہنسی آ گئی۔ ہیلن کہنے لگی، یو گٹ اپ چتر، اینڈ ہلپ مسٹر کرائسٹ ہائی ٹرانسلیٹنگ۔" بات یہاں تک پہنچی تھی کہ خچّر اور زاغ آ گئے ۔ چتر کہنے لگا، "چلو اب چلیں۔ بازار خالی ہو گیا ہے۔ دکانیں بند ہو گئی ہیں۔ بہت دیر ہو چکی ہے، اور ہمیں بہت دور پہنچنا ہے۔ باقی قصّہ خیمے میں بیٹھ کر سناؤں گا۔"

ہوا اور تیز ہو گئی تھی۔ وہ ہمارے لباس کبھی محبت میں آ کر بدنوں سے لپیٹ دیتی، اور کبھی رنجیدہ ہو کر انہیں اڑانے لگتی، لیکن اس کی خنکی بہرطور دل کو خوش کرنے والی تھی۔ ہم زاغ اور خچّر کی لائی ہوئی پیٹیز اور پھل کھاتے ہوئے بسوں کے اڈے کے رخ چل پڑے۔ وہاں انہوں نے بتایا کہ غروب آفتاب کے بعد نہ تو کوئی بس آتی ہے، نہ جاتی ہے۔ چتر نے تجویز دی کہ "پکی سڑک والا راستا بہت لمبا ہے، میں آپ کو پہاڑوں پر سے خیمے تک پہنچا سکتا ہوں، کچھ ایسا دشوار گذار بھی نہیں ہو گا، اور فاصلہ تو آدھے سے بھی کم ہو گا۔ میں پہاڑوں میں پیدل سفر کرتا رہا ہوں۔ میں بخوبی پہچانتا ہوں کہ ہمارا خیمہ اسی پہاڑ پر ہے، جس پر یہ قصبہ آباد ہے۔

Scanned with CamScanner

بس سمت کا خیال رکھنا ہے، اور میں اس میں ماہر ہوں۔ ہم بلاوجہ کیوں اتنا لمبا چکر کاٹیں؟"
سب تھکے ہوئے تھے، بلکہ بہت ہی تھکے ہوئے تھے؛ فاصلہ آدھا ہونے کے لالچ میں مان گئے۔ چتر نے ایک گھونٹ وھسکی کا لیا، اور سڑک پہ اسی ویرانے کا رخ کیا، جس تک ہم آج دن میں پہلے دو مرتبہ ہو آئے تھے۔ خرِعیسےٰ چلایا، "اوئے میں نے بھی خیمے میں پینی ہے، ساری ختم نہ کر دینا۔"
"فکر نہ کر، تیرے لیے بہت بچ رہے گی۔"

ہم سب اس سے قدم ملا کر چل پڑے۔ سڑک کی روشنیاں ختم ہو گئیں۔ آگے درختوں اور پہاڑوں کے ہیولوں کے سوا ہر شش طرف ایسا گھٹا ٹوپ اندھیرا، ایسا گہرا سکوت اور ایسا مکمل ویرانہ چھایا تھا کہ طبیعتیں گھبرا گئیں، اور خوف سے دل بھڑکتے چراغ کی لو کی صورت بےطرح دھڑکتے ہوئے لرز لرز اٹھے۔ لیکن ایک دوسرے سے ڈرتے ہوئے کسی میں اتنا حوصلہ نہ تھا کہ کہتا، واپس چلیں اور بڑی سڑک والا سیدھا راستا اختیار کر لیں، چاہے وہ کتنا ہی لمبا کیوں نہ ہو۔ کوئی آدھ میل اور چلے ہوں گے تو پکی سڑک نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ راستا تنگ ہو گیا اور ہم چھ، جو پہلے برابر چل رہے تھے، اب تین تین کی دو سطروں میں بٹے پتھروں پہ چلنے لگے۔ یہاں قدم قدم پہ جوتے پھسل پھسل جاتے۔ کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اتنے اندھیرے میں ہیولوں کی ساخت اور فاصلے کا بھی صحیح تعیّن ممکن نہ تھا۔ کچھ خبر نہ تھی کہ آگے پیچھے، دائیں بائیں، اوپر نیچے کیا ہے، اور ہم کہاں ہیں۔ ہمارا قیاس تھا کہ ہم اسی شنکل روڈ پہ چل رہے ہیں جو آج صبح اور شام کو ہم نے دور سے دیکھی تھی۔ بائیں طرف سمندر جتنی گہری وادی ہو گی، جس میں اب جگنو سا چمکتا کوئی دیا بھی نہیں تھا۔ قضا و قدر نے اسے دانستہ گل کر دیا تھا، تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارے سونے پن اور انجانے کے خوف کے عذاب میں کمی آ جائے۔ ہم ڈیڑھ گھنٹے تک، ماسوائے وقت کے زندگی کی ہر علامت سے عاری، عدم کی اس بےنشان اور بےمنزل راہ پر چلتے رہے تو وہ شنکل روڈ بھی ختم ہو گئی۔ راستا متواتر تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ اب ہم مٹی میں ملے ننھے ننھے پتھروں کی پگڈنڈی پر پہنچ گئے تھے، اور ایک کے پیچھے ایک کی اکہری قطار میں پھونک پھونک کر قدم دھرتے ہوئے یوں محسوس کر رہے تھے گویا کسی اونٹ کے لامتناہی کوہان پہ چلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کچھ خبر نہ تھی کہ اگلا قدم پگڈنڈی پہ پڑے گا یا کسی کھائی، کڑھے یا کھڈ میں جا پڑے گا۔ اندھیرے میں آنکھ صرف اگلے ساتھی کی پشت کا سایہ سا بمشکل دیکھ سکتی تھی۔ تعجب تھا کہ اس اندھیرے میں ڈیڑھ دو فٹ کے فاصلے تک بھی دیکھنا کیوں کر ممکن ہے۔ پتا چلا کہ اندھیرے سے خوگر ہو کر انسانی آنکھ میں اتنا دیکھ سکنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ سب سے آگے چتر تھا۔ اس کے بعد کون کون تھا کسی کو کچھ علم نہ تھا۔ ہر کسی کو بس اتنا پتا تھا کہ وہ چل رہا ہے، اور اگرچہ اس کا پاؤں بار بار پھسلا ہے لیکن ابھی تک کسی گہرے کھڈ میں نہیں گرا، اور وہ تا حال زندہ ہے۔ چوزے نے پوچھا، "کیا یہاں جنگلی جانوروں کا خطرہ ہو سکتا ہے؟"

چتر نے کہا، "میں سونگھ کر بتا سکتا ہوں کہ یہاں کوئی شیر چیتے نہیں ہیں۔ گیدڑ بھیڑیے ہیں اور وہ ہماری بو پا کر بھاگ گئے ہیں۔"

زاغ نے رنج بھری آواز میں پوچھا، "ہم پچھلے تین گھنٹے سے مسلسل چل رہے ہیں۔ یہ راستا اگر

چھوٹا تھا تو ہم ابھی تک پہنچے کیوں نہیں؟" ظاہر ہے یہ سوال چتر سے تھا، اور جواب بھی اسی نے دیا، "شروع میں یہ اندازہ نہ لگایا کہ اندھیری رات میں بادل چھا کر ستاروں کو اندھا کر سکتے ہیں، اور وہی ہو کر رہا۔ اب پگڈنڈی پہ راستا ہر ہر قدم پہ زمین پہ جھک کر، ہاتھوں سے ٹٹول کر تلاش کر رہا ہوں۔ مگر کوئی بات نہیں، تھوڑی سی ہمت اور درکار ہے۔ منزل آیا چاہتی ہے۔"

زاغ نے کہا، "یہ اندازہ تو تمھیں لگانا تھا۔"

چتر جھنجھلا کے بولا، "خیر سے آپ بھی عاقل و بالغ ہیں۔ خود اندازہ لگا لیتے، اور ادھر سے نہ آتے۔"

پہلے سے سبھی بھرے چلے آ رہے تھے۔ چتر کو تیزی کرتے دیکھا تو پھٹ پڑے، "اپنی چالاکی دکھانے کے شوق میں ایک تو تو نے حماقت کی، اور ہمیں بلاوجہ اس جان لیوا مصیبت میں پھنسا دیا، اور اوپر سے غصہ کر کے دکھاتا ہے۔ پتا نہیں ابھی ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔"

اتنے میں ایک چیخ بلند ہوئی۔ پہلے بُھد سے گرنے کی آواز آئی، پھر جیسے کوئی بھاری چیز ڈھلان پہ پھسلتی چلی گئی ہو۔ آپس کے بحث و مباحثہ سے توجہ ہٹی اور کوئی گر گیا۔ چتر نے آواز دی، "کون گرا ہے؟"

کوئی جواب نہیں۔ ایک مکمل سکوت اور خاموشی۔ ہر شخص جن قدموں پہ تھا، وہیں ٹھٹھک کے رک گیا۔

چتر نے کہا، "اپنے اپنے نام پکارو۔" زاغ ، بوم، چوزہ، خچر۔

"تو یہ خرِعیسےٰ ہے۔ یا تو بےہوش ہے یا بہت نیچے کہیں کھڈ میں جا گرا ہے۔"

زاغ نے کہا، "یا مر گیا ہے۔"

چتر نے چڑ کر کہا، "یہ بھی ہو سکتا ہے۔"

زاغ نے کہا، "حرام زادے، تو ہمیں اچھے راستے سے لایا ہے؟"

چتر نے تحمّل سے کہا، "دیکھو! یہ لڑنے کا وقت نہیں۔ ہمیں خرِعیسےٰ کو تلاش کرنا ہے۔ جس جس کے پاس ماچس ہے، نکال کر ایک ایک تیلی ہاتھوں میں پکڑ لو۔ میں ایک دو تین کہتا ہوں۔ جب تین کہوں تو سب تیلیاں یکبارگی روشن ہوں۔" ایسا ہی کیا گیا۔ بائیں طرف ڈھلان پہ کوئی، پگڈنڈی سے چھ فٹ نیچے، جھاڑیوں میں الجھی، ایک پتھر سے اٹکی، پتھر ہی کی طرح بےسدھ، کپڑوں کی ایک گٹھڑی نظر آئی۔ کپڑوں سے یقین ہوا کہ یہ خرِعیسےٰ ہے۔ تیلیاں بجھیں تو پہلے سے بھی زیادہ اندھیرا امڈ پڑا۔ چتر نے کہا، "اب کوئی بات نہیں۔ قریب ہی ہے، نکال لیں گے۔" اس نے پھر آواز دی، "خرِعیسےٰ، خرِعیسےٰ!" اب کے ایک ہلکی سی ہوں کی آواز آئی۔ چتر نے کہا، "خرُو سنو! اب ہم تیلیاں جلاتے جائیں گے۔ تم آہستہ آہستہ ان کی روشنی میں باہر آ جاؤ۔"

"میں تو اٹھتا ہوں۔ مگر اٹھ نہیں سکتا۔"

چتر نے کہا۔ "خرو، دیکھو ہم یہیں بیٹھ گئے ہیں، تم بالکل ڈرنا نہیں۔ ذرا سنبھل لو تو پھر کوشش کرنا۔" ہم سب وہیں پگڈنڈی پہ بیٹھ گئے۔ آدھ گھنٹے تک سبھی کے باربار اصرار کرنے پر بھی جب وہ باہر نکلنے کے لیے کسی طرح کی کوئی بھی کوشش کرنے پہ اپنے آپ کو تیار نہ کر

Scanned with CamScanner

سکا، تو زاغ نے کہا، "اس نے گر کر نئی مصیبت کھڑی کر دی ہے۔ چلو اب چھوڑو اسے۔ زندہ تو ہے، صبح آ کر نکال لیں گے۔"

ایک سیکنڈ تک، جو بہت بوجھل ایک سیکنڈ تھا، سکوت اور خموشی طاری رہی، جیسے لوگوں کے ضمیر اس اثنا میں زاغ کی تجویز کو رد کرنے کے لیے اس سے دست و گریباں رہے ہوں۔ سب سے پہلے چتر ایک پُرعزم آواز میں بولا، "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ سوچو ہم میں سے کوئی بھی گر سکتا تھا۔" پھر بوم اور چوزہ بولے، "جس نے جانا ہے چلا جائے۔ جب تک خرو نہیں نکلتا، ہم یہیں بیٹھے ہیں، چاہے صبح ہو جائے۔ کیوں خچر؟"

خچر نے کہا، "میں آپ کے ساتھ ہوں۔"

چتر نے خرعیسیٰ سے پوچھا، "خرو، تمھاری کوئی ہڈی وڈی تو نہیں ٹوٹ گئی؟"

"پتا نہیں۔ میرا بایاں پاؤں ذرا سا بھی بوجھ نہیں اٹھاتا۔" حادثے کے بعد پہلی بار اس کی آواز ہمیں اسی کی آواز معلوم ہوئی۔

بوم نے پوچھا، "باقی تو سب ٹھیک ہے؟"

"ہاں - باقی ٹھیک ہوں۔"

چتر نے کہا، "اچھا یوں کرو، تم گھٹنوں کے بل آہستہ آہستہ کھسکتے ہوئے ذرا اوپر آ جاؤ، پھر ہم تمھیں کھینچ لیں گے۔"

چتر نے خچر کا اور چوزے کا ہاتھ پکڑا، اور بوم دوسرا بازو پورا پھیلا کے نیچے جھکا، اور یوں خرو کو بدقت اوپر کھینچا گیا۔ زاغ ریفری کی طرح الگ کھڑا تماشا دیکھتا رہا۔ خرو باہر نکل کر ہمارے گھیرے میں بیٹھا سانس درست کرتا رہا۔ ہم سب نے ماچس کی تیلیاں جلا جلا کر اسے ہر طرف سے دیکھا۔ وہ ابھی تک خوف سے لرز رہا تھا، اور بار بار کہہ رہا تھا، "میں ٹھیک ہوں۔ میں ٹھیک ہوں"، جیسے اپنے آپ کو اپنی سلامتی کا یقین دلا رہا ہو۔ اس کے کپڑے، بال، چہرہ مٹی سے اَٹے تھے۔ وہ اس حادثے پر کچھ پشیمان اور زیادہ تر شکستہ دل دکھائی دے رہا تھا۔ ہر شخص خوش تھا، شاید خرو کے زندہ سلامت نکل آنے پر، یا اس خوش قسمتی پر کہ وہ خود حادثے کا شکار نہیں ہوا۔ چتر نے کوچ کا بگل بجایا۔ سب چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ طے پایا کہ ہم میں سے ہر ایک باری باری پچاس پچاس قدم تک خرو کو سہارا دے گا، اور وہ ایک پاؤں پر پھدک پھدک کر چلے گا۔ ہم بلند قامت پہاڑ کی ایک پتلی سی پسلی پر چلتے چلتے تقریباً اس کے اوپر پہنچنے والے تھے، اور خیال تھا کہ وہاں سے درختوں اور جھاڑیوں بھرا میدان شروع ہو گا، جس کے وسط میں کہیں ہمارا کیمپ ہے۔ خرو ایک ہاتھ اٹھتی ہوئی چٹان کے ساتھ لگا کر، اور دوسرا ساتھی کے کندھے پر رکھ کر، پھدک پھدک کر چڑھائی چڑھ رہا تھا۔ ہوا کچھ دیر سے بند تھی، اور پھر پھوار پڑنی شروع ہو گئی۔ پھسلنے کے خوف سے ہماری رفتار اور کم ہو گئی۔ جب تک چڑھائی چڑھ کر ہم گنجان درختوں اور گھنی، اونچی، پاؤں پکڑنے والی گھاس کے میدان میں پہنچے، تو سیلاب میں پھنسے ہوئے چوہوں کی طرح بھیگ چکے تھے۔

میدان کی سطح ہموار نہ تھی بلکہ اونچی نیچی تھی۔ مٹی اور پتھروں سے بنی، پانچ پانچ فٹ اونچی منجمد لہریں اس میں جمی کھڑی تھیں۔ اس میں چلتے ہوئے ہم کل دار کھلونوں کی طرح

بار بار لڑھک جاتے۔ خرو لڑھکتا تو ساتھ ہی ایک چیخ بھی بلند ہوتی، جس پر ہم بھی ہنستے اور گالیاں بکتا ہوا خرو بھی ہنستا۔ ہم بہت دیر تک یونہی اس جنگل میں چتر کی راہ نمائی میں چلتے رہے، لیکن کیمپ گراؤنڈ کا ابھی تک کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ خرو کے زندہ سلامت کھڈ سے نکل آنے کی خوشی اب مٹ سی گئی تھی، اور ہم منزل سے مایوس ہوکر ایک بار پھر بددل ہونے لگے تھے۔

زاغ بولا "چتر، مان لے تو سمت کا تعین نہیں کر سکا، اور اب ان جنگلوں میں ہمیں کسی وحشی جانور کے ہاتھوں شکار کرا دے گا۔"

بوم بولا، "ہمیں بھلا سیدھا راستا چھوڑنے کی کیا ضرورت پڑی تھی، چاہے وہ لمبا ہی تھا۔ اب تک کبھی کے کھانا کھا کے خیمے کے اندر گرم بستروں میں سو رہے ہوتے۔ تو نے ہمیں خواہ مخواہ مروا دیا۔"

خچر نے کہا، "چتر، کیا ہم ساری رات اسی جنگل میں مارے مارے پھرتے رہیں گے؟"

چوزہ بولا، "سردی اور بارش نے میرے ہاتھ پاؤں شل کر دیے ہیں۔" اس نے ثبوت کے طور پر دو تین چھینکیں ماریں۔

خرو نے کراہتے ہوئے تجویز دی، "یوں کرو، تم لوگ مجھے یہیں چھوڑ دو۔ میں بالکل بھی نہیں چل سکتا۔ خیمہ مل جائے گا تو مجھے آ کر لے جانا۔"

"تم لوگ یہیں ٹھہرو، میں ابھی آتا ہوں۔" چتر نے اتنا کہا، اور اونچی گھاس میں جتنا تیز چلنا ممکن تھا، اتنا تیز آگے نکل گیا۔ بمشکل دس منٹ گزرے ہوں گے کہ وہ واپس آ گیا۔ "بزدلو اٹھو۔ وہ سامنے مربّع کمرا ہے، جس کے باہر تالا پڑا ہے اور اندر خاک نہیں۔ اس سے آگے تمھارا موعودہ خیمہ نصب کھڑا تمھارا منتظر ہے۔ اٹھو اور چلو۔" ہمیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہم خیمے تک پہنچ گئے ہیں۔ دور ایک کوندا سا لپکا۔ نیلی روشنی میں وہی اداس کمرا سامنے کھڑا تھا۔ ہم دوڑے، جیسے بچے اسکول سے چھٹی پا کر دوڑتے ہیں۔ اب خرو بھی بغیر سہارے کے اپنے بائیں پاؤں پہ کچھ کچھ بوجھ دیتا، پیچھے پیچھے لنگڑاتا چلا آ رہا تھا۔ جب خیمے میں پہنچے تو بارش کا پانی کپڑوں سے نچڑ رہا تھا۔ پہلے سے روشن لالٹین کی بتی اونچی کی۔ یوں لگا جیسے پتا نہیں کتنے زمانے کے بعد ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ رہے ہیں۔ حیرت ہوئی کہ اتنا بہت سا وقت گزرنے پہ بھی شکلوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ بوم بولا، "آج بہت تکلیف اٹھائی۔ ولے بخیر گزشت۔ موت ہمیں صرف چھو کر گزر گئی۔ کیا بجا ہوگا؟"

کسی نے بتایا، "دو بج رہے ہیں۔"

زاغ بولا، "فیزنٹ اس وقت پلاؤ قورمہ کھا کے مزے سے نواب بنا بیٹھا ہو گا، اور سامنے جمیلہ اور سعیدہ ناچ رہی ہوں گی۔"

چتر نے جیب سے بوتل نکال کر ہوا میں بلند کرتے ہوئے نعرہ لگایا، "پیاری جمیلہ، تیرے نام!" اور ایک لمبا گھونٹ کھینچا۔

Scanned with CamScanner

صبح ہوئی تو ہر ایک بستر سے یوں نڈھال اٹھا جیسے مہینوں سے بیمار ہو۔ چوزے کو تو باقاعدہ بخار ہو گیا اور وقفے وقفے سے ایسی کھانسی اٹھتی کہ لگتا ابھی پھیپھڑے باہر تھوک دے گا۔ خرو کا بایاں ٹخنا سوج کر کپّا ہو رہا تھا اور بغیر سہارے کے ایک قدم اٹھانا دوبھر تھا۔ باری باری سب نیند سے برآمد ہو رہے تھے۔ بارش رات بھر جاری رہی۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی ابھی بھی ہو رہی تھی۔ خوش قسمتی تھی کہ ملازم صبح صبح ڈیوٹی پر حاضر ہو گیا، اور گرما گرم چائے کا پیالا اس نے ٹرے میں سجا کر ہر ایک کو بستر میں پیش کر دیا۔ ہم میں سے ہر شخص بستر میں تکیے سے کمر لگائے، چھاتی تک کمبل کھینچے، شہنشاہ بابر بنا بیٹھا تھا۔ خیمے میں رہنے کا پہلا اصول یہ وضع ہوا تھا کہ ہر کوئی اپنی ذات اور اپنی چیزیں اپنے بستر کی حد تک پھیلا سکتا ہے۔ جونہی علاقہ غیر شروع ہوا تو دوسرے آدمی کو اختیار تھا کہ آپ کی ذات یا آپ کی املاک، جو اس کی حدود کی خلاف ورزی کریں، ان سے جو سلوک چاہے روا رکھے۔ بیشتر اوقات سلوک ایسا ہی روا رکھا جاتا جو روایتی بادشاہوں کے مابین ہوا کرتا تھا، لیکن کبھی کوئی بکھیر بھی جاتا۔ صبح صبح جب ہر کسی کا موڈ اچھا تھا تو خچر نے اپنے نام کی لاج رکھتے اعلان کیا کہ اس کے بستر پر کسی کی قمیض آ گئی ہے۔ پھر اس نے کھڑے ہو کر انگلی کے اشارے سے ہر کسی کو وہ قمیض دکھائی۔ قمیض استری کر کے تہہ شدہ رکھی تھی۔ خچر نے دوبارہ موقع دیتے ہوئے کہا کہ اس کا مالک فوراً اسے اٹھا لے، نہیں تو وہ باہر بارش میں پھینک دے گا۔ ہر ایک نے قمیض پر نظر ڈالی۔ چوزہ بھی بیماری کے باوجود قمیض دیکھنے کے لیے اٹھا۔ خچر نے آخری وارننگ دی، اور پھر قمیض گچھو مچھو کر کے خیمے سے باہر پھینک دی۔ وہ پڑی مینھ میں بھیگتی رہی۔ کوئی پانچ منٹ گزرے تو خچّر، جو تکیے سے کمر لگائے بیٹھا تھا، یک دم "اوہ!" کہتے ہوئے اٹھا اور برق رفتاری سے باہر لپکا۔ "میری آخری قمیض مینھ میں برباد ہو گئی!" ہر کسی کے حلق سے ایک زور دار قہقہہ ابھرا اور خچر بھیگی قمیض پھیلائے کھڑا افسوس سے سر ہلا رہا تھا۔ خچر کی اس حواس باختگی پہ سب بستروں پر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئے اور اسےکیا کیا خچّرگی کے طعنے نہ دیے۔ وہ سر ہلا ہلا کر اپنی آخری قمیض کے خراب ہونے پر افسوس کرتا رہا۔ خرو کو دفعتاً شراب یاد آ گئی۔ لیٹے لیٹے چتر کو مخاطب کر کے پوچھا، "اوئے، وہ رات والی شراب کہاں گئی؟" اس نے کونے میں تہہ کر کے رکھے کوٹ کی جانب اشارہ کیا، "پڑی ہے جیب میں ویسی کی ویسی۔ وہی چند گھونٹ جو تمھارے سامنے لیے تھے، اس کے بعد کہاں پی ہے۔ رات تو نے گر کے ہمارے ہوش گم کر دیے۔ شراب کسے یاد رہتی؟"

"تو نکالو اب پئیں۔"

چتر نے کہا، "تم رہے نہ وہی کے وہی۔ بھائی یہ بھنگ نہیں شراب ہے۔ یہ انگریز کا مشروب ہے، اور اس نے اسے پینے کے کچھ آداب مقرر کیے ہوئے ہیں۔ یہ ساوی نہیں کہ جب چاہا مٹی کا پیالا بھرا۔ اور الٹا کے منھ سے لگا لیا۔ دیسی موسیقی کی طرح اس کے اوقات مقرر ہیں۔ وھسکی غروبِ آفتاب کے بعد پی جاتی ہے، سہ پہر بیر پینے کا وقت ہوتا ہے، اور صبح میں لک لپٹ کے کام کرتے ہیں۔ اس سفر میں کچھ تو عقل کی باتیں سیکھ لے مجھ سے۔"

اتنے میں ناشتہ آ گیا۔ سب نے ڈٹ کے کھایا۔ چوزہ لیٹا رہا، اور سب کے اصرار کے باوجود کسی

چیز کو منھ نہ لگایا۔

چتر نے پوچھا، "ہاں بھئی، آج کا کیا پروگرام ہے؟"

بوم نے کہا، " چھوڑو پروگرام کو۔ ابھی تک کل کی تھکاوٹ ہی نہیں اتری۔ چوزہ بھی علیل ہے کل چلیں گے۔ آج پتا نہیں فیزنٹ بھی کس وقت واپس پہنچے۔"

چتر نے کہا، "ہم تو ہیلن سے وعدہ کر کے آئے تھے کہ آج کی رات اس کے گیسٹ ہاؤس میں گزاریں گے۔ تو کوئی بات نہیں، تم لوگوں سے کل ریستوران کے سامنے ملاقات ہو جائے گی۔ کیوں خرو؟"

وہ بولا، "ہاں جی، ہیلن تو ہمیں کل ہی نہیں آنے دے رہی تھی۔ بڑی مشکل سے قسمیں دے دلا کر اس نے ایک دن کی مہلت دی تھی۔ میں قصبے میں اپنا ٹخنا بھی کسی ڈاکٹر کو دکھا لوں گا۔"

زاغ اور خچر بھی تیار ہو گئے کہ جوجی اور سیمی کو ایک نظر دیکھ آئیں، اور شام تک پلٹ آئیں گے۔ اس اثنا میں بارش رک گئی تھی اور بادل کہیں غائب ہو گئے تھے۔ آسمان صاف تھا۔ نکھری ہوئی دھوپ میں پوری دنیا آئینے کی طرح صاف شفاف چمک رہی تھی۔

بوم نے پوچھا، "خر، وہاں پیدل کیسے پہنچو گے؟"

اس نے کہا، "پیدل تو میں ایک ہفتے میں بھی نہیں پہنچ سکتا۔ یہاں سے بس لیں گے، چاہے کتنا ہی انتظار کیوں نہ کرنا پڑے۔ اڈے سے دستی رکشا پکڑ لیں گے۔"

چاروں تیار ہوئے، اور چل دیے۔ چتر اور خرو نے کچھ سامان بھی ساتھ لے لیا۔ چلتے چلتے چتر نے بوم سے پوچھا،

"تمھارے پاس پیسوں کی کیا پوزیشن ہے؟"

بوم مسکرایا، " تمھیں پتا ہی ہے۔"

چتر نے خرعیسیٰ سے کہا، "یار! تو فی الحال اسے میرے دس روپے دے دے۔ تیرا میرا حساب بعد میں ہوتا رہے گا۔"

خرو نے جھٹ دس روپے کا نوٹ نکال کر بوم کو دے دیا۔ چتر نے بوم کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر رازداری کے انداز میں کہا، "گھبرانا نہیں۔ کوئی یہاں رہے یا نہ رہے، مگر کیمپ کے اخراجات میں سب اسی طرح برابر کے شریک رہیں گے۔ خوب کھاؤ پیو، عیش کرو، بس ذرو مت۔ ڈرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ حوصلہ رکھو۔ اس سفر میں تمھیں خرچ سے نہیں مرنے دوں گا۔ بہت پیسے ہیں، بہت۔ ان بھاری بٹووں میں جو کچھ ہے وہ سب اپنا ہی ہے۔" لنگڑا لنگڑا کر چلتے خر کو بوم سہارا دیے سیڑھیاں اتار رہا تھا۔ خچر اور زاغ نیچے اتر گئے تھے۔

وہ چاروں میدان سے نکلے تو سناٹا، جو کہیں چھپا بیٹھا تھا، ہر چیز پر قابض ہو گیا۔ بوم نے خیمے کے مشرقی دروازے کے بھی دونوں پٹ کھول کر خیمے کی اطراف پر ڈال دیے۔ چیڑھ کے لمبے تڑنگے درختوں کے سلائیوں جیسے باریک پتوں کے گچھوں کی چوٹیوں پہ سورج خاموش کھڑا چمک رہا تھا، اور ہر طرف تیکھی مگر اداس کرنیں انڈیل رہا تھا۔ دھوپ اپنی روشنی کے ساتھ اتنی ہی خموشی اور اداسی لیے خیمے کے وسط تک اتر آئی۔ بوم کے کان، ہنس مکھ، خوش باش چڑیوں کی چہچہاہٹ سننے کو ترس گئے تھے۔ وہ شاید پہاڑوں پر نہیں ہوتیں۔ اپنے گھر کا آنگن

Scanned with CamScanner

اس کی آنکھوں میں گھوم گیا، جہاں اس لمحے کچی دیوار کے پاس گھنے بیری کے درخت پر اچھلتی کودتی، بہت مصروف، معصوم چڑیوں کا جھنڈ گلی کے شوخ کھلنڈرے بچوں کے مقابلے میں شور مچا رہا ہو گا۔ ایک کوّا کہیں سے اڑتا ہوا آیا اور چیڑھ کی ایک اونچی شاخ پہ آن بیٹھا۔ اس نے ایک رخ کائیں کائیں کی آواز لگائی، پھر پھدک کر، الٹی رخ چونچ بڑھا کے، دو مرتبہ کائیں کائیں کی، اور پھر مایوس سا ہوا میں تیرتا ہوا کہیں چلا گیا۔ اس کے آنے اور اتنی جلد مایوس ہو کر اڑ جانے کی وجہ بوم کی سمجھ میں نہ آ سکی۔

بوم نے چوزے سے پوچھا، "اب طبیعت کیسی ہے؟" کوئی جواب نہ آیا۔ وہ اپنے چہرے پر بازو رکھے اسی طرح پہلو کے بل بےحس و حرکت پڑا رہا، جیسے سوال اس سے نہیں کسی اور سے کیا گیا ہو۔ اتنی جلد سو بھی گیا، بوم نے اس کا ہاتھ ہٹا کے دیکھا۔ وہ رو رہا تھا۔ بوم کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں پکڑ کر بھینچ دیا ہو۔ وہ تڑپ گیا۔ "کیا بات ہو گئی؟ کہیں کوئی درد ہے؟ طبیعت زیادہ گھبرا رہی ہے؟"

"نہیں۔"

"آخر کچھ تو ہے۔ تم رو کیوں رہے ہو؟"

"مجھے اپنی ماں یاد آ رہی ہے۔ اصلی ماں۔" وہ بمشکل اتنا کہہ پایا، اور پھٹ پڑا۔ وہ آواز کو جتنا بھی دباتا وہ بےقابو ہو کر اس کے حلق اور ناک سے ابل پڑتی۔ پاس بیٹھے بوم نے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا، اور اس کے سر اور کمر پہ ہاتھ پھیر پھیر کر ڈھارس بندھانے لگا۔ الفاظ کا رشتہ اس کے ہاتھ سے گم ہو گیا۔ ہزار کوشش کے باوجود اسے کہنے کو کچھ نہ مل سکا۔

پچھلے ایک ڈیڑھ سال کے عرصے میں بوم نہ چاہنے کے باوجود آہستہ آہستہ چوزے کی محبت میں پھنستا چلا گیا تھا، جیسے سورج آہستہ آہستہ رات کے پھندے میں جا پھنستا ہے۔ جب وہ نصف النّہار پہ ہوتا ہے تو کون گمان کر سکتا ہے کہ وہ رات کی چادر میں الجھ کر یوں گم ہو جائے گا۔ رات کے پھیلے مغرور اندھیرے اپنے عروج پہ کب سوچ سکتے ہیں کہ سحر انہیں یوں لوٹ کر لے جائے گی کہ کچھ باقی نہ رہے گا۔ اس جذبۂ بےاختیار سے لڑتے لڑتے وہ اتنا عاجز آ چکا تھا کہ اب کچھ اس کے اختیار میں نہ تھا۔ وہ حیران تھا کہ نہاں خانۂ دل میں اتنی تاریک اور پیچ در پیچ بھول بھلیاں ہو سکتی ہیں، جن میں وہ اکیلا راہ ڈھونڈتا رہا ہے، جہاں سرے سے کوئی راہ نہ تھی۔ مرد کا مرد سے عشق، جسے وہ ہمیشہ ایک مضحکہ خیز صورت اور ابتذال کی انتہا سمجھتا تھا، اس میں وہ خود گرفتار ہو جائے گا۔ یہ سب کیسے اور کیوں کر ہوا؟ اس راز میں وہ کسی اور کو بھلا کیونکر شریک کر سکتا تھا، جب اس کی اپنی شخصیت کا نصف اب تک اس سے منکر کیا، اس کے بارے میں سننے کی تاب نہ رکھتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے اندر ہی خوف و ہراس کے ایک خول میں بند ہو گیا۔ اسے پوری دنیا میں اپنی ذات سمیت کچھ اچھا نہیں لگتا تھا، سوائے چوزے کے قرب کے، لیکن اس کے سامنے بھی وہ لب بند گم بیٹھا رہتا۔ کبھی کچھ نہ کہہ سکا۔ وہ اس سفر پر بھی اسی کی خاطر چلا آیا تھا۔ آج وہ اس واضح حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ فیزنٹ کو شک سا تھا کہ بوم چوزے سے پیار کرتا ہے، اسی لیے ذرا سا بھی

موقع ملنے پر وہ کوئی نہ کوئی ہلکا پھلکا طنز ان کے آپس کے بڑھتے ہوئے میل ملاپ پر کر دیتا، "بوم! تو بگلا بھگت ہے۔ کسی کو پتا نہیں چلنے دیتا اور بیچ ہی بیچ میں کام دکھا رہا ہے!" یہ ہنس کر رہ جاتا۔

چوزے کے جذبات آنسوؤں میں بہہ چکے تو سنبھلا۔ ہچکیوں اور بار بار اٹھتی کھانسی کے درمیان کہنے لگا، "میں جب بھی اداس ہوتا ہوں تو مجھے ماں یاد آنے لگتی ہے۔ مجھے اس کے چہرے کا کوئی نقش، بدن کا کوئی خط، ہونٹوں سے نکلا ہوا کوئی بول، کچھ بھی تو یاد نہیں۔ لیکن وہ مجھے پھر بھی یاد آتی ہے۔ میرے اندر اس کے بچھڑ جانے کا دکھ بسا ہے، اس کی چاہت کا احساس ہے۔ پتا نہیں اس نے مجھے پیار کیا بھی تھا یا نہیں، لیکن مجھ میں اس کی چاہت کا احساس باقی ہے۔ کیا خبر یہ اصلی ہو یا میرے اپنے خیال کی اختراع ہو! لیکن ہمہ وقت میرے دل کے آس پاس گھومتا رہتا ہے۔ مجھے بہت بھلا لگتا ہے۔ لیکن جب یہ شدّت سے آتا ہے تو مجھے جھنجھوڑ کے رکھ دیتا ہے۔ میں کئی کئی دن گہری اداسی میں ڈوبا رہتا ہوں ۔ میں اس کی شدت سے گھبراتا ہوں، اور دعائیں کرتا ہوں کہ یہ آتش فشاں سویا رہے، جاگے نہ۔ جب کچھ دن گزر جاتے ہیں تو اسے بلانے پہ مجبور بھی ہو جاتا ہوں، بلکہ وہ خود ہی سب بند توڑ کر آن وارد ہوتا ہے۔ کچھ یاد نہ ہونے کے باوجود اماں جب بھی خواب میں آتی ہے تو میں جھٹ پہچان جاتا ہوں کہ اماں ہے۔ خواب کتنے اچھے ہوتے ہیں، کہ بالکل یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں اماں سے کبھی بچھڑا ہی نہیں، جیسے وہ کبھی مری ہی نہیں۔ ہم دونوں اکٹھے ہیں یونہی ازل سے، اور ابد تک کبھی الگ نہ ہوں گے۔ آج صبح خواب میں آئی تھی! سفید کپڑے تھے، بھوچھن (دوپٹہ) یوں سر، کندھوں پہ لپٹا تھا جیسے نماز سے اٹھ کر آ رہی ہو۔ مجھ سے بہت پیار کیا۔ جانے لگی تو میں نے کہا، اماں میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔ پلٹ آئی، اچھا! میں تو چاہتی تھی کہ تم یہیں ٹھہرتے! اگر اتنی ضد کرتے ہو تو چلو۔ میں نے اس کے ساتھ ایک پورا قدم بھی نہیں اٹھایا تھا کہ آنکھ کھل گئی۔ بوم، یہ میری زندگی کا آخری دن ہے۔ میں خوش ہوں کہ آج اس کے پاس پہنچ جاؤں گا۔"

بوم عجیب مخمصے میں تھا۔ جہاں ایک خوابیدہ خواہش، چوزے کے خوبصورت بدن سے لپٹ جانے کی خواہش، کے پورے ہونے کی صورت نکلی تو وہاں حالات ایسے تھے کہ چوزہ غم و اندوہ کے سمندر میں ڈوبا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے اور کیا کرے۔ چوزے کے جسم کے لمس سے اسے ایک سکون کا احساس تو تھا لیکن وہ چوزے کے شدید جذباتی ہیجان سے بھی بےبہرہ نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ واضح نہیں تھا کہ وہ اس کے دکھ میں زیادہ شریک ہے یا اس سے لپٹنے پہ زیادہ محظوظ ہے ۔ دونوں لہریں بیک وقت اپنی اپنی جگہ اس کے ذہن میں تیزی سے چل رہی تھیں۔ بوم نے اسے اور زیادہ لپٹا کر اپنا گال اس کے سر پہ رکھ دیا۔ "میری جان کیوں دل چھوٹا کرتے ہو۔ اللہ کرے گا سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے محض چپ سے گھبرا کے دو فقرے بول دیے۔ چوزہ بتانے لگا، "میں جب بھی اداس ہوتا ہوں تو اماں کی قبر پہ چلا جاتا ہوں۔ وہاں بیٹھا رہتا ہوں اور روتا رہتا ہوں۔ گھنٹے گزر جاتے ہیں۔ جب طبیعت سنبھلتی ہے تو اٹھ کے گھر آ جاتا ہوں۔ یار! مرنے والوں کے ساتھ کون مر سکتا ہے۔"

بوم نے بخار سے تپتے چوزےکو سینے کے ساتھ بھینچ رکھا تھا، اور نڈھال، اداس، گم سم، اس

Scanned with CamScanner

کے سینے کے ساتھ کمر لگائے بیٹھا تھا۔ اگرچہ آنسو تھم چکے تھے، لیکن ان کی نمی سے ابھی تک اس کا چہرہ گیلا تھا۔ پھر پتا نہیں کیا ہوا کہ بوم کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ پہلے تو اسے خود یقین نہ آیا کہ وہ رو رہا ہے۔ جب آنسوؤں کا دوسرا ریلا آیا تو یقین کرنا پڑا۔ پھر سسکیاں آنے لگیں۔ چوزے نے حیرت سے پلٹ کر اس کے منہ کی طرف دیکھا، "بوم تم رو رہے ہو؟ کیوں؟"

وہ کیا جواب دیتا؟ اسے خود علم نہیں تھا کہ وہ کیوں رو رہا ہے۔ ذہن نے ایک تواتر میں یکے بعد دیگرے کئی وجہیں اس کے سامنے پیش کیں؛ وہ کسی کو بھی ماننے کے لیے تیار نہ تھا، مگر سبھی اپنی اپنی جگہ درست معلوم ہوتی تھیں۔

وہ چوزے کی ہمدردی میں رویا، اظہارِ تمنّا کی ناکامی پہ رویا، اپنی محبت کے ایک ناممکن العلاج دکھ ہونے پہ رویا، ہم آغوشی سے تشنگی اور بڑھنے پہ رویا، تکمیلِ خواہش کے تشکّر میں رویا، چوزے پہ موت کی پرچھائیں پھیلی دیکھ کر رویا، پارہ صفت روح انسانی کے اس مقدر پہ رویا جس نے اضطراب اور بےکلی کو ہر حال میں اس کا حصہ ٹھہرا دیا ہے، نے تابِ وصل دارم نے طاقتِ جدائی پہ رویا۔ اس کے آنسو تھم گئے تھے۔ چوزے نے کہا، "میں تھک گیا ہوں۔ مجھے لِتا دو۔" اس نے نہایت آہستگی سے اس سہانے بوجھ کو بستر پہ لٹا دیا، اور اپنے چوزے کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہ پاتے ہوئے اٹھ کر باہر چلا گیا۔

وہ بلامقصد دیودار کے لمبے تڑنگے درختوں کے جنگل میں، اداس دل اور مضمحل جان لیے، صاف سبک ہوا اور روشنی میں گھومتا رہا۔ ان کے کھردرے بھورے تنوں پہ ہاتھ پھیر پھیر کے دیکھتا، پھر سر اونچا کر کے ان کی پھیلی ہوئی بڑی بڑی چھتریوں پہ نظر دوڑاتا۔ کہیں کوئی کالی چڑیا نیلے آسمان کو گھورتی بیٹھی دکھائی دے جاتی۔ وہ چلتا ہوا اگلے درخت کے پاس جا کھڑا ہوتا۔ درخت بس کھڑے، جی رہے تھے، نہ خوش نہ غمگین۔ انسان اگر درخت ہوتا تو اس کی جبلّی بےچینی اسے یوں بندھ کے کھڑا نہ رہنے دیتی۔ یا تو وہ مر جاتا، یا پھر چلتا۔ سورج درختوں کی چوٹیوں پراب تک ذرا اور بلند ہو گیا تھا۔ فطرت کی یہ شدت سے چمکتی آنکھ نہایت سرعت سے کرنیں اگلے جا رہی تھی، اور اس کی خاکی آنکھوں میں کہاں یہ تاب تھی کہ اس چشمۂ نور سے ابلتی ہوئی شعاعوں کے سیلاب کو ایک بار بھی نظر بھر کے دیکھ سکیں۔ اسے علم تھا کہ ایک ایسی جرأت کا جواب وہاں سے عمر بھر کے اندھے پن کی صورت میں ملے گا۔ اس نے سوچا کہ سورج اگر سوا نیزے پر آن رکے تو کچھ اتنا ہی بلند ہو گا، یا اس سے کچھ کم۔ شاہ شمس نے جب اسے مچھلی بھوننے کے لیے طلب کیا تھا تو اور نیچا آن ٹھہرا ہو گا، کیونکہ یہاں سے تو مچھلی نہیں بُھن سکتی۔ چوزے سے عشق کا سورج بھی تو اب میری جان سے صرف سوا نیزے پہ آن ٹھہرا ہے۔ لگتا ہے یہ ابھی کچھ اور نیچے آئے گا۔ تو مچھلی مَیں ہوں، اور وہ بھی مردہ، جسے بھوننے کے لیے یہ سوا نیزے پر آیا ہے۔ جو کچھ دیر اور نہ بُھنے تو بُو دے جائے گی۔ اس کے حق میں یہی بہتر ہے کہ جتنی جلد بھن سکے بھن جائے۔ اس سارے کھیل میں جب سورج، مچھلی، شاہ شمس، بوم، چوزہ، ایک ہی ڈور میں بندھ جائیں گے، تو پردہ گرے گا۔ ان بھول بھلیّوں میں گم، کچھ دیر پھرنے کے بعد وہ اپنے آپ سے ڈر کر بھاگا، اور خیمے میں واپس آ گیا۔ چوزہ بخار سے سرخ چہرے تلے ہاتھ رکھے کمبل لیے سو رہا تھا۔ وہ احتیاط سے قدم رکھتا چوزے کے بالمقابل بچھے

خچر کے بستر پہ نیم دراز ہو گیا، اور نظریں چوزے کے چہرے پہ گاڑ دیں۔ لمبی لمبی پلکیں، ٹھوڑی اور گالوں میں خم، جیسے کسی نے مکھن کے پیڑے پہ انگوٹھے سے ہلکے ہلکے سے دباؤ دےکر چھوڑ دیا ہو، اوپر والے ہونٹ اور قلموں سے نیچے بڑھی آتی نیلی نیلی ہلکی ہلکی فر، الجھے بکھرے، لمبے لہریا بالوں کا چھتا۔ ظالم کتنا خوبصورت ہے۔ نظر بھر کر دیکھنے سے ایک بار تو سانس رک جاتی ہے۔ لیکن جتنا خوبصورت ہے، اتنا ہی مظلوم اور دکھی بھی۔ اس کا دل بری طرح چاہا کہ وہ سویا رہے اور وہ بغیر اسے پتا چلے اس کے نازک، حساس ہونٹ صرف ایک بار چوم سکے۔

بوم نے چوزے کو پہلی بار کالج کی اسٹیج پر ہیروئن کا پارٹ ادا کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ بوم پر ہی کیا منحصر، اس وقت سارا کالج اس پہ عاشق ہو گیا۔ بوم بھی تھوڑے دنوں بعد اسے بھول بھال گیا۔ ڈراما چند دن چل کے ختم ہو گیا، لیکن شروع شروع میں عشاق کی بھرمار نے چوزے کا ناک میں دم کر دیا۔ علاوہ کالج کے لڑکوں کے، شہر کے دل پھینک بھی کبھی اس کی سائیکل پکڑ لیتے۔ کچھ جہاندیدہ قسم کے عشاق نے ہمہ وقتی باڈی گارڈ بننے کی پیش کش بھی کی۔ جب اس کی زندگی ہر طرح سے حرام ہو کر رہ گئی تو وہ ایک دن ہمت کر کے پرنسپل کے پیش ہو گیا، اور اس سے تحفّظ کا طالب ہوا۔ اس نے بجائے پولیس کو شکایت کرنے کے، فیزنٹ کو بلوا کے کہا کہ وہ چوزے کی حفاظت کرے۔ اس نے قبول کر لیا اور ذمّے داری نبھائی۔ ویسے جھوٹ موٹ کی عاشقی گاہے گاہے جتاتا رہتا، جو چوزہ اور ہم سب بخوبی سمجھتے تھے۔ اسے عمر بھر میں صرف ایک ہی شعر یاد رہ سکا تھا، جو اس نے کسی نوٹنکی وغیرہ میں کبھی سنا تھا، اور بعض اوقات چوزہ جب ہم میں کسی کے ساتھ زیادہ بےتکلفی برتتا تو ازراہِ تفنن پڑھتا،

ملنا جلنا رقیباں دا بند کر دے
نہیں تے مخملی ڈھڈ تیڈا پاڑ دیساں

فیزنٹ کے تحفظ میں تو وہ آ گیا، لیکن ہم سب کا دوست نہ بن سکا۔ شاید اس کی بڑی وجہ ہمارے اور اس کے درمیان سماجی اور معاشی تفاوت تھا، یا وہ ویسے ہی جھینپو اور کم آمیز تھا۔ فیزنٹ اسے واپسی پر گھر پہنچا دیتا، اور اس نے اسے خوب سمجھا دیا تھا کہ اگر کوئی اسے تنگ کرے تو بلاجھجھک بتا دے، مناسب انتظام ہو جائے گا۔ جب وہ روزانہ فیزنٹ کے برابر سائیکل چلاتے ہوئے گھر جانے لگا، تو ہر خاص و عام کو اطلاع ہو گئی کہ وہ فیزنٹ کی پناہ میں ہے۔ اس لیے عام عاشق تو ویسے ہی چھٹ گئے۔ چوزے کی کلاس میں ایک لڑکا تھا، نہایت غریب اور شاید کسی دور دراز گاؤں کا رہنے والا۔ اس نے میٹرک میں وظیفہ لیا تھا اور سنہرے مستقبل کے خواب دیکھتا ہوا شہر کے کالج میں آن داخل ہوا اور اپنے سے بھی بدحال کسی رشتے دار کے پاس شہر سے باہر کھیتوں میں ایک جھونپڑی نما کچے کوٹھے میں رہنے لگا۔ فیزنٹ سے پہلے وہ چوزے کو مقدور بھر تحفّظ دیا کرتا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ چوزہ بڑے لوگوں سے رسم و راہ بڑھا رہا ہے، اور اس کی خدمات سے بےنیاز ہو گیا ہے، تو حسد سے جل اٹھا۔ ایک دن اس نے حسبِ سابق چوزے کو پیش کش کی کہ "آؤ میں تمہاری سائیکل پہ تمہیں گھر پہنچا دوں اور آگے پیدل اپنی جھونپڑی کو چلا جاؤں گا" تو اس نے یہ پیش کش ٹھکرا دی۔ انکار کرنے کے انداز میں غالباً کسی قدر رعونت اور بےنیازی کا انداز بھی شامل ہو گا۔ وہ چوزے کی بےرخی سے جلا ہوا تو پہلے ہی

Scanned with CamScanner

تھا، یوں انکار پہ بھڑک اٹھا اور چوزے کو مارنا شروع کر دیا، اور اس بےدردی سے مارا کہ اس کا چہرہ سوج گیا اور کپڑے تار تار ہو گئے۔فیزنٹ کے ساتھ ہم سب بھی وہاں پہنچ گئے۔ جب چوزہ اس کے چنگل سے چھڑا لیا گیا تو کھدر کی شلوار قمیض والا سیدھا سادھا دیہاتی لڑکا ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر چوزے کے ہمدردوں کی مار کھاتا رہا اور اُف نہ کی، اور اسی جگہ پہ بت بنا جم کے کھڑا رہا۔ اتنے میں پرنسپل موقع پر آ گیا۔ اس نے بچوں کی سی راستی سے بلا عذر تسلیم کر لیا کہ اس نے چوزے کو مارا ہے اور اس لیے کہ وہ برداشت نہ کر سکتا تھا کہ چوزہ اسے چھوڑ کر دوسروں کے ساتھ دوستی کی پینگیں بڑھائے۔ پرنسپل نے کھڑے کھڑے اسے کالج سے نکال دیا۔ اس دن کے بعد وہ ہمیں نظر نہیں آیا۔ خدا معلوم اس کا کیا بنا۔ اس واقعے کے بعد چوزے کے عشاق کی رہی سہی ہمت بھی ختم ہو گئی اور وہ ہمارے گروہ کا رکن تسلیم کیا جانے لگا، لیکن ہم نے اسے اس طرح اپنایا جیسے کوئی لاوارث بچے کو رحم کھاتے ہوئے اپنے پاس رکھ لے۔ فیزنٹ نے چوزے کی حفاظت کے لیے بوم سے کہا، "یارا یہ تیرے راستے میں رہتا ہے، تو صبح کالج آتے ہوئے اسے گھر سے لے لیا کر۔ ایسا نہ ہو وہ پھر اس پر حملہ کرے۔ چند دن احتیاط کی ضرورت ہے۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔" بوم ہر صبح چوزے کو ٹاٹ لگے دروازے پر آواز دیتا، وہ سائیکل لے کر نکلتا، اور دونوں باتیں کرتے کالج پہنچ جاتے۔ پہلے پہل بوم نے جب چوزے کو کالج کے اسٹیج پر لڑکی کے روپ میں دیکھا تو وہ اسے پسند آیا۔ اس کے اندر ایک جنسی ہوس خواہش پیدا ہوئی کہ کاش یہ لڑکی ہوتا تو وہ جان کی بازی لگا دیتا لیکن اسے بہر صورت بھگا کر لے جاتا۔ لڑکے کا لڑکے سے عشق اس کی عقل و فہم سے باہر ایک چیستان تھا۔ اس کے دل میں اس جذبے کے خلاف نفرت نہیں، بلکہ حقارت تھی۔ ہاں، جنسِ مخالف کا جہاں تک تعلق ہے، وہ اس کی توجہ کے لیے ترستا تھا، لیکن اس کے پورے ہونے کا کوئی امکان نہ تھا۔ بوم مہاجر ہو کر اس شہر کے ریلوے اسٹیشن پر پہلے دن تنہا وارد ہوا، اور منزل پر پہنچنے کے لیے اس نے سالم تانگا کرائے پر لیا۔ کوچوان تیس پینتیس برس کا ایک سوکھا سڑا شخص تھا۔ سر پہ بڑا سا ڈھیلا ڈھالا پگڑ، تہمد اور قمیض میلے اور پھٹے پرانے، آنکھیں غالباً ساوی کے نشے سے سرخ، وہ اگلی سیٹ پر بڑی شان سے نیم دراز تھا۔ اس کے ساتھ تانگے میں ایک چھوکرا تھا، عمر کوئی تیرہ چودہ برس، سرخ و سفید رنگ اور بہت اجلی ریشمی شلوار قمیض پہنے ہوئے تھا۔ اس نے تیل سے چیڑے بال بائیں طرف مانگ نکال کر سنوارے ہوئے تھے۔ ابھی اس کی مسیں نہ بھیگی تھیں۔ لڑکا بہت شوخ تھا۔ کبھی راہ چلتے لوگوں پر اور کبھی دوسرے تانگے والوں پر آوازے کستا، کبھی گھوڑے کو چابک سے چھیڑ دیتا، کبھی کوچوان کی پسلیوں میں ٹھوکا دیتا، کوچوان سے گھوڑے کی باگیں چھین لیتا، کبھی واپس پکڑا دیتا۔ غرض اسے ایک پل چین نہ تھا۔ اس کی یہ ادائیں کوچوان نیم وا آنکھوں سے دیکھتا جاتا اور مسکراتا جاتا۔ کوچوان کے چہرے سے اطمینان چھلک رہا تھا۔ راہ میں بھنگ کا ٹھیکا پڑتا تھا۔ لڑکا تانگا روک کر اترا۔ ایک پیالا خود پیا، اور ایک کوچوان کو لا کر پلایا۔ پیسے شان سے کھیسے سے نکال کر دیے، اور واپس تانگے میں آ گیا۔ ٹھیکے والے نے اپنے اڈے سے بیٹھے بیٹھے کوچوان کو نشے میں مست آواز میں پکارا،

"لالہ بخشو، مزے ہیں نا آج کل۔ ڈاھڈا سوھنا چھوکرا قابو کیتی ودا ایں؟"

بخشو نے جھومتے ہوئے سر جھکا کر، آسمان کی طرف ہاتھ بلند کرتے ہوئے اشارہ کیا، اور تشکر میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا، "میڈے مولا دیاں کرم نوازیاں ہیں سائیں۔"

بوم کو اس عادتِ قبیح کے یوں سماجی لحاظ سے قابلِ قبول ہونے پر ذہنی دھچکا لگا۔ اس کے دل میں اس کے خلاف نفرت اور بھر گئی۔

بوم پہلے تو ایک جذبۂ خدمت کے تحت ہر روز چوزے کو گھر سے لیتا تھا، پھر اسے اس میں لطف آنے لگا۔ جب اسے گھر سے لینے کی ضرورت باقی نہ رہی تو بھی اس نے یہ معمول جاری رکھا۔ اب وہ گہرے دوست بن چکے تھے۔ پہلے تو وہ اسے اس خوبصورت لڑکی کی وساطت سے پسند کرتا آیا تھا جسے اس نے اسٹیج پر دیکھا تھا، اب چوزہ اسے ویسے ہی اچھا لگنے لگا، لیکن یہ اچھا لگنا دوستی کے عام تعلق سے کہیں زیادہ تھا۔ یہ لگاؤ کچھ ایسا تھا جو بوم کے جی جان کی گہرائی تک سماتا چلا گیا تھا، اور اب سوچ سوچ سے اسے لاچار اور بےبس کرتا جا رہا تھا۔ ایسی دوستی پہلے تو اس کے تجربے میں کبھی نہ آئی تھی۔ یہ تو اب کہیں جا کر بوم پر واضح ہو رہا تھا کہ وہ دوستی کے پردے میں چوزے پر فریفتہ ہو چکا ہے۔ چوزہ جس دن نہ ملتا وہ کھویا کھویا رہتا اور کچھ اچھا نہ لگتا۔ چوزے کی ذرا سی تکلیف پر وہ بےقرار ہو جاتا، اسے بلا کر اپنے گھر لے جاتا اور آنے بہانے پہروں سامنے بٹھائے رکھتا مگر کسی طرح سیری نہ ہوتی۔ اس قسم کی محبت سے اسے سخت نفرت تھی، اس لیے چوزے سے محبت کرنے کے تصور سے بھی بدکتا تھا۔ عجیب محبت تھی، جسے وہ خود تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھا، لیکن وہ تھی۔ اس محبت کو ایک بھید کی طرح اس نے اپنے دل کے قلعے کے اندر قید کر رکھا تھا، اور خود بھی ساتھ ہی اندر بند تھا۔ اس نے اظہار کے ہر ذریعے پر پہرے کھڑے کر دیے تھے، پھر بھی اسے خطرہ رہتا کہ کوئی بھانپ نہ جائے۔

ویسے تو چوزے کے چاہنے والوں سے شہر بھرا تھا، لیکن بوم ان سے کوئی خطرہ محسوس نہ کرتا تھا، البتّہ اس کا اپنا تخیل ایسے رقیب وضع کر کر کے اس کا دل جلاتا رہتا، جن سے اسے یہ خوف ہوتا کہ ان کی خوبصورتی کی وجہ سے اگر چوزے کی اپنی طبیعیت ان پر مائل ہو گئی تو وہ اس دیہاتی لڑکے کی طرح کٹنے مرنے کے لیے اکیلا رہ جائے گا۔ ایک دن حسبِ معمول چوزہ اس کے مکان پر بیٹھا تھا تو اس نے اسے ٹٹولنا شروع کیا، "چوزے! تمہیں ڈرامے میں ہیروئن بننا کیسا لگا؟"

"ٹھیک تھا۔"

"لڑکی بنتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوئی؟"

"رول کرنے سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"اس ڈرامے میں کچھ اور لڑکوں نے بھی عورتوں کے رول ادا کیے تھے۔ زنخے لگتے تھے۔ لیکن تم صحیح طور پر ایک خوبصورت اور مکمل دوشیزہ نظر آتے تھے۔" پھر اس نے ڈرتے ڈرتے اصل سوال بھی پوچھ ہی لیا۔ "ہیرو تمہیں کیسا لگا؟"

"اچھا تھا، لیکن جو وہ اظہارِ محبت کرتا اور اپنی وفا کا یقین دلاتا تو وہ ڈائیلاگ، جو پتا نہیں کس نے، کس کو تصور میں رکھ کر لکھے ہوں گے، میرے اندر ٹھنڈک سی پیدا کرتے چلے جاتے۔

Scanned with CamScanner

میں چاہتا کہ کاش یہ سچ ہوں۔"

یہ مبہم سا جواب سن کر بوم کا چہرہ اتر گیا اور وہ افسردہ ہو گیا۔ یہ وہ جواب تو نہ تھا جو وہ سننا چاہتا تھا۔ بہت دیر تک خاموشی چھائی رہی اور بےچینی اس کے دل میں کلبلاتی رہی۔ امید کی ایک ہلکی سی کرن کے دھاگے سے اس کا دل بندھا ڈول رہا تھا۔ یہ سوچتے ہوئے اس نے بلاواسطہ سوال پوچھ ہی لیا کہ یا تو یہ امید کی کرن بھی مٹ جائے یا پھر سب وسوسے صاف ہو جائیں: "وہ لڑکا جو ہیرو بنا تھا اس نے کبھی تمہیں ملنے کی کوشش نہیں کی؟"

"نہیں۔"

"اس نے کبھی اپنا حق تم پہ نہیں جتایا؟"

"نہیں، مگر کیسا حق؟" یہ سن کر بوم کھِل اٹھا اور ہنستے ہوئے کہنے لگا، "میرا مطلب تھا عاشقی کا حق، وہ ہیرو تھا نا۔ اسٹیج پر لمبے لمبے محبت آمیز ڈائیلاگ جو بولتا تھا۔" موضوع بدلنے کے لیے ساتھ ہی اس نے یہ سوال جوڑ دیا، "چوزے! تمہیں کبھی کسی لڑکی نے نہیں لبھایا؟"

"نہیں، مجھے لڑکیاں ویسے ہی اچھی نہیں لگتیں۔ تم لوگ پتا نہیں کیوں ان کے پیچھے دیوانے ہوئے پھرتے ہو۔ زرد، اداس چہرے سامنے آتے ہیں، ہراساں، چور نظروں سے تکتے ہوئے، ایک گھبراہٹ کے عالم میں کہیں گم ہو جاتے ہیں۔ نہ انہیں بات کرنا آتی ہے، نہ ہنستی ہیں، نہ روتی ہیں، بس سحرزدہ سی صرف گھورتی ہیں، جیسے کہہ رہی ہوں کہ ہمیں کہیں لے جاؤ، کسی پناہ گاہ میں۔ اپنے سے بھی زیادہ بیمار نظر آتے بچوں کو کولہوں پر مٹکاتی رہتی ہیں، جیسے اپنی آئندہ کی مصنوعات کے سیمپل دکھا رہی ہوں۔"

کل شام جب قصبے میں سنیما کے پاس وہ دونوں اکیلے کھڑے تھے تو بوم نے اس کی یہی بات یاد دلاتے ہوئے پوچھا، "آج تو تم نے بہت سی صحت مند چہروں والی لڑکیاں دیکھی ہیں اور دو کو تو ابھی بہت قریب سے دیکھ کر آ رہے ہو۔ ان کے بارے میں تمہارے خیالات میں کوئی تبدیلی آئی؟"

"ارے چھوڑو یار، سب ایک سی ہوتی ہیں۔ بیوقوف ۔ بچوں کی طرح۔"

"نہیں، ایسی بھی کیا بات ہے۔"

"خیر! میری سمجھ کا کوئی پھیر ہو گا۔ انگریزی گرامر میں دیے، shall اور will کے استعمال کی طرح مجھے کبھی ان کی گرامر بھی سمجھ نہیں آ سکی۔ پتا نہیں کب ان کی ہاں کا مطلب نہ ہوتا ہے اور نہ کا مطلب ہاں ہوتا ہے، اور کب ہاں کا مطلب ہاں اور نہ کا مطلب نہ ہوتا ہے۔ راستے سے ہٹانا بھی چاہتی ہیں اور نہیں بھی چاہتیں، رکنا بھی چاہتی ہیں اور نہیں بھی رکنا چاہتیں، جانا بھی چاہتی ہیں اور نہیں بھی جانا چاہتیں! کچھ عجیب سا چکر ہے ان کا۔"

نوکر خیمے کے اندر آیا، "صاحب کھانا تیار ہے۔" بوم نے کہا، "لے آؤ۔"

صبح سے اب تک دو تین مرتبہ چوزے نے اس سے پانی مانگا، جو اس نے سہارا دے کر بٹھاتے ہوئے اسے پلایا۔ وقفے وقفے سے اسے کھانسی کا دورہ پڑتا اور وہ اسے سنبھالتا۔ ہر مرتبہ جب اس نے چوزے کے شدید بخار سے تپتے بدن کو چھوا، تو ہاتھوں کے لمس نے پورے بدن کو سنسنی سے بھر دیا۔ چوزے پر بخار کی نیم بےہوشی کے عالم میں بھی برابر بے کلی طاری رہی۔ اس کی چھاتی

سے خر خر کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کھانسنے سے اس کی سانس پھول جاتی، اور وہ نقاہت سے بےسدھ ہو کر گر پڑتا اور سانس بہت دیر تک ویسے ہی پھولی رہتی۔ بوم نے پیار اور نرمی سے اس کا کندھا ہلا کر بیدار کیا۔ بخار سے مخمور آنکھیں حیرانی سے کھول کر اس نے بوم کو دیکھا، جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ "میں نے تمہارے لیے مرغ کی یخنی بنوائی ہے، ایک پیالی لے لو! تم نے ناشتے میں بھی کچھ نہیں کھایا۔"

"مجھے بھوک نہیں، تم کھاؤ"، یہ کہہ کر کراہتے ہوئے اس نے کروٹ بدلی اور آنکھیں بند کر لیں۔ بوم نے تھوڑا سا کھا کے کھانا اٹھوا دیا۔ اتنے میں فیزنٹ خیمے میں داخل ہوا۔ ایک ہاتھ میں مٹھائی کا لفافہ اور دوسرے میں پھلوں کی ٹوکری پکڑی ہوئی تھی۔ اس نے پوچھا، "باقی سب کہاں ہیں؟" فیزنٹ کی کراری آواز سن کر چوزہ بھی مسکراتا ہوا اٹھ کے بیٹھ گیا۔ چوزے نے پھولی ہوئی سانس سے بتایا، "وہ قصبے گئے ہیں، رات کو لوٹیں گے۔"

بوم نے اصلاح کی، "زاغ اور خچّر تو لوٹ آئیں گے، لیکن چتر اور خرعیسے رات ہیلتھ گیسٹ ہاؤس میں ٹھہریں گے۔"

"اچھا تو یہ ٹھاٹھ ہیں ان کے۔ لیکن بوم، تیری صورت پر آج اتنی زیادہ نحوست کیوں برس رہی ہے؟ چوزے! ساڑھے تین بج رہے ہیں اور تو ابھی تک پڑا سو رہا ہے؟ اٹھ، تو یہاں سیر کرنے آیا ہے کہ سونے کے لیے آیا ہے؟"

بوم نے بتایا، "اسے شدید بخار اور کھانسی زکام ہو رہا ہے۔ رات بارش میں بھیگ گئے تھے، اور تو ٹھیک رہے، اسے بخار ہو گیا۔"

"اچھا تو یہ بات ہے۔ تینوں تاپ چڑھے میں ہونگاں۔ کوئی فکر کی بات نہیں۔ کھانسی زکام کون سی بیماری ہے، کل تک ٹھیک ہو جائے گا۔ بوم تو بالکل نہ گھبرا، چوزے کا میں ذمّے دار ہوں۔"

اس مردنی چھائے خیمے میں فیزنٹ کے آنے سے رونق آ گئی۔ بیمار اور تیماردار دونوں کِھل اٹھے۔ فیزنٹ نے بستر پر بیٹھ کر چوزے کو گود میں لے لیا، "او میری جان، میں تیرے قربان، تو کیوں بیمار ہو گیا؟ کاش تیری جگہ مجھے بخار ہو جاتا۔ لے یہ مٹھائی کھا۔" اس نے لفافہ کھول کر برفی کی بڑی سی ڈلی اس کے منھ میں ٹھونس دی۔ بوم نے پوچھا، "رات کیسی گزری؟ ہماری تو بہت بری گزری۔"

"کیوں، اس کی بیماری سے؟"

"نہیں، چتر کی ضرورت سے زیادہ چالاکی نے مروا دیا۔ کہنے لگا، پہاڑوں کے بیچ میں سے لیے چلتا ہوں، فاصلہ آدھے سے بھی کم پڑے گا۔ بہت بری ہوئی، خرعیسے کھڈ میں جا گرا اور پاؤں میں موچ آئی۔ راستا بھولے، بارش میں بھیگے، کیا کچھ نہیں ہوا۔ صبح دو ڈھائی بجے یہاں پہنچے۔"

"ہماری تو بہت مزے میں گزری۔ صبح تین بجے تک مجرا ہوا اور شراب چلی۔ جمیلہ اور سعیدہ گاتے گاتے اور ناچتے ناچتے نڈھال ہو گئیں۔ آخر ان میں آواز نکالنے اور پاؤں اٹھانے کی سکت نہ رہی۔ سازندے الگ تھکے ہارے، جمائیاں لے لے کر بدحال ہو رہے تھے۔ مہمان رخصت

Scanned with CamScanner

ہوے۔ جمیلہ میرے کزن رشید خان کے ساتھ اس کے کمرے میں چلی گئی، اور سعیدہ کو میں اپنے بیڈروم میں لے گیا۔ پہلے تو نخرے کر رہی تھی، کچھ نوٹ دیے تو مان گئی۔ ہائے ظالم کا کیا بدن ہیا کپڑے تو اس کے بدن کی اچھائیوں کو تہمت کی طرح نظروں سے اوجھل کیے رکھتے ہیں۔ لباس کھول کر اندر سے دیکھا تو پتا چلا کہ وہاں کیسا کیسا باغ عدن کھلا ہے، کہ بوم، تو بھی چوزے کو بھول جائے۔"

بوم نے مسکراتے ہوے کہا، "لباس کے نیچے سعیدہ کا جو حسن ہو سو ہو، لیکن اس کی ایک خوبی مانتا ہوں کہ اس نے تم جیسے اجڈ کو رات رات میں شاعر بنا دیا۔"

فیزنٹ نے قہقہہ لگایا، "ارے کہاں، یہ فقرے تو خان رات نشے میں جمیلہ سے بار بار کہہ رہا تھا تاکہ وہ کپڑے اتار کر ناچے۔ ویسے وہ بھی کہاں کا شاعر ہے، اس نے کسی اور سے کہیں سنے ہوں گے۔ اچھا، تو میں بتا رہا تھا کہ میں اور سعیدہ صبح آٹھ بجے تک جاگتے رہے۔ میرا سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ وہ چر چر بولے جا رہی تھی۔ بڑی مشکل سے اسے سونے پر آمادہ کیا۔ ویسے باتیں اتنی دلچسپ کرتی ہے کہ جی چاہتا ہے وہ سناتی رہے اور آدمی سنتا رہے۔ بات سے بات پیدا کرنے میں خاص کمال حاصل ہے۔ معمولی واقعے کو اس طرح سجا بنا کے بیان کرے گی کہ آپ ہنستے ہنستے تھک جائیں۔ آج رات پھر وہی پروگرام ہے۔ میں خان کی کار میں آیا ہوں۔ ڈرائیور نیچے کھڑا ہے۔ میں اب اس پر واپس لوٹ جاؤں گا۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ چوزے کے گالوں کو تھپتھپایا، "صبح تک انشاء اللہ ٹھیک ہو جاؤ گے۔ اچھا بھئی کل بارہ بجے بازار میں ملیں گے۔ کھانا ریستوران میں کھائیں گے۔ ٹھیک ہے، بل میں دوں گا۔"

جاتے جاتے مڑ کے بولا، "اوئے چوزے، اس بوم سے بچ کے رہنا، نہیں تے مخملی ڈھڈ تیڈا پاڑ دیساں۔"

دن ڈھل گیا اور شام ہو گئی۔ نوکر نے لالٹین صاف کر کے تیل بھرا اور خیمے کی چھت سے لٹکا دی۔ پھر رات کا کھانا بنا کے لے آیا، اور ایک کونے میں رکھ کر گھر جانے کی اجازت چاہی۔ بوم نے کہا، "جاؤ۔ صبح جلدی آ جانا۔" چوزے کا بخار بدستور تیز تھا۔ بوم اس کے برابر بیٹھ کر سر دبانے لگا۔ باہر شام اتنی سنولا گئی تھی کہ خیمے کے اندر اندھیرا بھر گیا۔ دور پیچھم میں، گہری وادی کے پار، پہاڑوں کے اوپر سرخی، پتا نہیں کتنی کروڑویں بار اپنے معمول کے مطابق، انگارا سی بنی دھک رہی تھی۔ اور بوم نے کروڑویں بار دہرائی جانے والی بات چوزے سے کہی، جیسے اس کرۂ ارض پر فطرت کے ایک بہت گہرے انجانے راز کو وہ پہلا شخص ہے جو محسوس کر کے افشا کر رہا ہو۔

"چوزے؟"

"ہاں؟"

"ایک بات کہوں، برا تو نہ مانو گے؟"

"کہو؟"

"مجھے تم سے بےحد پیار ہو گیا ہے، میرے نہ چاہنے پر بھی! میں نہیں جانتا کیوں۔"

"میں جانتا ہوں کیوں۔ ایک تنہا صحرا تھا جیسا کہ ایک تنہا صحرا ہوتا ہے، ایک تپتا سورج تھا جیسا کہ تپتا سورج ہوتا ہے، کالے کوسوں کا کڑا سفر تھا جیسا کہ کالے کوسوں کا کڑا سفر ہوتا ہے، ہر طرف قہقہوں کی گونج تھی جیسی کہ طنزیہ قہقہوں کی گونج ہوتی ہے، اس صحرا کے وسط میں دو مسافر تھے جیسے کہ ہم دو مسافر ہیں۔ اور بس۔"

"اور بس؟"

"ہاں اور بس۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنا بخار سے جلتا ہوا گرم ہاتھ اٹھا کر اس کے چہرے کو چھوا۔ بوم نے اس ہاتھ کو اپنے گال پر ہاتھ سے دبا لیا۔ پھر اسے چوما، اور سینے سے لگا لیا۔ وہ بہت دیر تک اسی طرح بیٹھے رہے۔ گم سم، خاموش، بوم کے دل کی دھڑکنیں چوزے کے ہاتھ کے ذریعے اس میں جذب ہوتی رہیں، اس کے اندر سرایت کرتی رہیں۔ چوزے نے کہا، "بوم، مجھے یوں لگتا ہے جیسے موت خیمے کے اندر جھانکے گی اور لوٹ جائے گی۔"

چوزے کو بخار کی غنودگی نے ایک بار پھر اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ آنکھیں بند ہو گئیں، اور بوجھل بوجھل سانس آنے لگے۔ بوم آہستگی سے اٹھا، لالٹین روشن کی، اس پر کمیل درست کیا اور باہر اندھیری رات میں نکل گیا۔ کالا آسمان ادھر ادھر بکھرے، چمکتے روشن ستاروں سے بھرا جھلملا رہا تھا۔ بوم نے سوچا، اس بےنظمی میں بھی ایک نظم ہو گا جسے وہ نہیں سمجھتا۔ وہ کیا سمجھتا ہے؟ کچھ بھی نہیں سمجھتا۔ ان سیاہی میں نہائے کھڑے درختوں کی طرح۔ لیکن کیا خبر یہ کچھ سمجھتے ہوں، صرف بتا نہ سکتے ہوں۔ وہ پتھر سا بنا، چلتا چلتا ایک پتھر پر جا بیٹھا۔ ابھی جو کچھ گزرا اس پہ وہ نہ تو پشیمان تھا نہ متاسف، نہ خوش نہ مغموم! بس حیران تھا، ہر ستارے کی طرح جو ہمہ تن چشم حیراں بنا، پٹ سے کھلا، دیکھ رہا تھا۔ کیا وہ کچھ دیکھ بھی رہا تھا، یا صرف آنکھ ہی روشن تھی، اور ذہن اسی طرح بند اور ماؤف؟ اس نے اظہارِ محبت کیا اور چوزے نے اسے قبول کر لیا۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر وہ اسے دھتکار دیتا۔ چار چھ مہینے میں رو دھو کر صبر کر لیتا۔ لیکن اب اس کی انتہا کیا ہو گی؟ وہ کہاں جا کے ٹھہریں گے؟ ان کی منزل کیا ہو گی؟ جگ ہنسائی اس کے کانوں میں گونجی، گلی گلی رسوائی اور بدنامی کا غلغلہ مچتا سنائی دیا۔ وہ خوف اور مایوسی سے تھرّا اٹھا۔ کیا وہ دونوں فطرت کے کسی تلوّن کا شکار ہیں؟ کیا وہ ایسے عجیب الخلقت ہیں، جو فطرت کے کسی خوفناک تجربے کے خام مال کے طور پر پیدا کیے گئے ہیں؟ اس نے اپنا موازنہ تانگے والے سے کیا تو خود کو بہت بزدل پایا۔ اس نے جانا کہ پہلے تو موازنہ کرنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہی گھٹیا جذبہ اس کے اندر بھی موجود ہے، جسے وہ تسلیم کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ تانگے والا محض ایک جواز کے طور پر ابھر کر سامنے آیا ہے۔ پھر اس پر ندامت ہوئی کہ وہ گھٹیا شخص جو کچھ بھی ہے، اور جو کچھ بھی کر رہا ہے، اس پر اسے فخر اور اطمینان ہے۔ وہ اسے اگر گھٹیا ہی مانتا ہے، تو اس کو رد کر کے آگے کیوں نہیں بڑھ جاتا؟ اسے رہ رہ کر فطرت کا خیال آنے لگا جس نے اسے اس تجربے کے لیے پھانس لیا تھا۔ ہمارے دکھ اور ہماری الجھنیں یہاں بالکل بےحیثیت ہیں! انہیں کوئی نہیں پوچھتا۔ فطرت جو چاہے کرے، مالکِ کُل ہے۔ کیا خبر ہمارے مزاجوں کی اس بےنظمی میں بھی کوئی نظم ہو، جو ہماری سمجھ

Scanned with CamScanner

سے بالاتر اور ہماری نظروں سے مخفی ہے۔ لیکن ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ بدنی ضرورت کی شدّت ہو جس نے مجبور ہو کر یہ رخ اختیار کر لیا ہو۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے شہر واپس پہنچ کر رنڈیوں کے پاس جائے گا، کئی دنوں تک متواتر یہ جذبہ اگر پھر بھی اسی طرح موجود اور غالب رہا تو وہ ہتھیار رکھ دے گا، اور اپنے حق میں دیے گئے فطرت کے غلط فیصلے کو تسلیم کر لے گا۔ وہ غائب دماغ اسی ادھیڑ بن میں بیٹھا تھا کہ سامنے سے کوئی سیڑھیاں چڑھ کے آتا دکھائی دیا۔ اس نے گھبرا کے آواز دی، "کون ہو تم؟"

"ارے یار، خچّر ہوں اور کون ہوں۔"

"اوہ اچھا!" کہتے ہوئے وہ حال میں واپس آ گیا، "اکیلے آ رہے ہو، زاغ کہاں ہے؟"

"وہ کل آئے گا ۔ آج وہ بس میں نیچے شہر چلا گیا ہے، کسی رشتے دار سے قرض لینے۔ کل سے قصبے کے کسی ہوٹل میں ٹھہرنا چاہتا ہے۔"

"کیا بجا ہو گا؟"

"نو بج رہے ہیں۔ چوزے کا کیا حال ہے؟"

"ویسا ہی ہے، تم اپنی سناؤ ۔ آؤ اندر چلتے ہیں۔"

خچّر بتانے لگا، " یار آج بڑا کامیاب دن رہا۔ سیمی اور جوجی آئی تھیں۔ وہاں ویرانے میں بیٹھی ہم سے باتیں کرتی رہیں۔ کل شام آنے کا وعدہ کر گئی ہیں۔ اسی لیے زاغ ہوٹل میں کمرہ لینا چاہتا ہے۔"

چوزہ جاگ رہا تھا، اور کراہ رہا تھا۔ اس کی سانس پہلے سے کہیں زیادہ تیز ہو رہی تھی۔

"بوم، تم کہاں چلے گئے تھے؟ میرے سینے میں شدید درد ہو رہا ہے۔ سانس لینے میں بھی دشواری ہے۔"

"تم سو رہے تھے، میں یہیں باہر پتھر پر بیٹھ گیا۔ آواز دی ہوتی۔"

"مجھے اٹھا کر بٹھا دو۔"

انھوں نے پیچھے تکیے لگا کر بٹھا دیا۔ "ہاں! اس طرح سانس کچھ بہتر ہے۔" یہ کہتے ہوئے اسے کھانسی کا دورہ اٹھا، اور سرخ سرخ خون کا بڑا سا لوتھڑا کمبل پہ آ رہا۔ یہ دیکھ کر تینوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

کمبل بدلا گیا۔ بوم نے الگ لے جا کر خچر کے کان میں کہا، "خچر، انھی قدموں سے فوراً واپس قصبے لوٹ جاؤ۔ ہیلن کا گیسٹ ہاؤس آسانی سے مل جائے گا۔ چتر اور خر کو ساتھ لے کر فیزنٹ کو تلاش کرنا مشکل نہ ہو گا۔ وہ رشید خان نامی شخص کے بنگلے پر ہے۔ اس کی حالت بتا کر رشید خان کی کار پر ڈاکٹر کو لے آؤ، یا اسے ہسپتال منتقل کرنے کا انتظام کرو۔ جلدی! میں جانتا ہوں اسے کیا ہو گیا ہے۔ خطرہ ہے۔ سُستی نہ کرنا۔" خچر قصبے کے لیے دوڑ پڑا۔

اس نے اسے دو کمبل اڑھا دیے اور تولیہ اس کے منہ کے نیچے پھیلا دیا۔ چوزے کی آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے پڑ گئے تھے اور چہرہ زرد تھا۔ نظر آ رہا تھا کہ اسے ایک ایک سانس کھینچنے کے لیے زور لگانا پڑ رہا ہے۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ "بوم، ہاتھ میرے سینے پر رکھ دو، درد ہے۔ لگتا ہے اماں کے پیار میں تجھ سے زیادہ کشش ہے۔" اتنا کہا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اب کے

اس کی آواز میں نقاہت نمایاں تھی۔

"چوزے، ایسی باتیں نہ کرو۔ خچر ابھی ڈاکٹر کو لے کر آ جائے گا۔ ہمت نہ ہارو، تم جلد صحت یاب ہو جاؤ گے۔" اس نے بند آنکھوں سے اثبات میں ذرا سی گردن ہلائی۔ ہر سانس کھینچنے کے لیے چوزے کو گردن اٹھا کے زور لگانا پڑتا۔ یہ عذاب دیکھتے ہوئے اس کی ہر سانس کے ساتھ بوم کی نس نس سے جان نچڑتی۔ وہ اضطراب کے عالم میں ٹہلنے لگا۔ وہ دعا کر رہا تھا، "یا اللہ اس کو صحت دے، یا مجھے بھی ساتھ اٹھا لے۔" چوزے نے آنکھیں کھولیں۔ بوم نے چہرہ ایک طرف کر کے آنسو پونچھے اور پاس بیٹھ گیا۔

"چوزے، کیا بات ہے؟ خدا کے لیے اب ٹھیک ہو جاؤ۔ اور کچھ نہیں تو اپنی سانس تو ٹھیک کر لو۔ للّٰہ کچھ تو کرو۔ ایسے کیسے ہو گا۔"

"اندھیرے اچھے لگتے ہیں۔ نازک نازک سے۔"

اسے پھر کھانسی کا دورہ پڑا۔ تولیہ خون سے بھر گیا۔ گردن تکیوں پر لٹک گئی۔ دو تین اکھڑی اکھڑی سانسیں آئیں، اور پھر ختم۔

چوزے کے سامنے بوم یوں حواس باختہ آنکھیں پھاڑے بےدست و پا کھڑا تھا، جیسے چوزے کی موت نے اس کی ہر حس، ہر تاثر، ہر احساس کو، پانکا ہونے والے ہرنوں کی طرح پانک کر، شکاری کی جیپ کی تیز روشنی کے بالمقابل لا کر کھڑا کر دیا ہو۔

چوزہ سفید چادروں میں لپٹا ایمبولینس کے بیڈ پر تختے کی طرح سیدھا لیٹا تھا، اور بوم اس کے قریب سیٹ پر حواس گم بیٹھا تھا۔ ڈرائیور نے دروازہ بند کیا اور ایمبولینس چل پڑی۔ اس کے پیچھے رشید خان کی بڑی کار، جس میں باقی پانچ ساتھی بہ چشمِ نم، مغموم اور اداس بیٹھے تھے، چل پڑی۔ بوم سے انھوں نے کہا کہ وہ بھی کار میں آ جائے لیکن وہ نہ مانا۔ پہاڑی راستہ آدھا ختم ہوا ہو گا کہ ایک بڑی سی کار پیچھے آئی اور آگے نکل گئی، جس میں جوجی اور سیمی کچھ بڑی عمر کی عورتوں کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ دونوں نے ہاتھ باہر نکال کر ویو کیا! جوجی نے تو پلٹ کے دیکھا بھی، اور بڑی سی مسکراہٹ پھینکی۔ چتر نے آنسو بھری آنکھوں کے باوجود بےقرار ہوتے ہوئے پوچھا، "یہ کون لوگ ہیں؟"

زاغ نے دبی زبان میں بتایا، "میری اور خچّر کی دوست ہیں۔"

خرگیسنے اور فیزنٹ بھی رونا بھول کر ہشیار ہوئے۔ اتنے میں وہ کار ایمبولینس سے آگے نکل چکی تھی، جس میں دو مُردے اپنی منزل کی طرف رواں تھے! اور اس کار میں زندہ لوگ، کشمکشِ حیات میں پوری طرح لتھڑے، اپنی اپنی منزلوں کی تلاش میں رواں تھے، اگرچہ بظاہر لاشیں لے جانے والی ایمبولینس کے پیچھے جا رہے تھے۔

Scanned with CamScanner

سالانہ خریداری

چار شماروں کی قیمت ۱ سو روپے

آج

خزاں ۱۹۸۹

تارا شنکر بنرجی
سیتہ جیت رے
اسد محمد خاں
محمد خالد اختر
ڈونلڈ بارتھیم
ولیم سیرویان
افضال احمد سید
ذی شان ساحل
نسرین انجم بھٹی
سعید الدین
نیّر مسعود
فروغ فرخ زاد
بابا مقدّم

قیمت: پچیس روپے
مکتبۂ دانیال سے طلب کیجیے

آج کی کتابیں

آج ۱ پہلی کتاب	ترتیب ۱ اجمل کمال	قیمت ۱۲۰ روپے
چھینی ہوئی تاریخ (نظمیں)	افضال احمد سید	قیمت ۴۰۱ روپے
بوفِ کور (ناول)	صادق ہدایت	قیمت ۱۵۱ روپے
بارہ ہندوستانی شاعر	ترتیب ۱ اجمل کمال	قیمت ۲۱۱ روپے
خیمۂ سیاہ (غزلیں)	افضال احمد سید	قیمت ۳۰۱ روپے
آوارگی (منتخب تراجم)	محمد عمر میمن	قیمت ۴۰۱ روپے
آج ۱ دوسری کتاب	ترتیب ۱ اجمل کمال	قیمت ۲۴۱ روپے

تقسیم کار ۱ مکتبۂ دانیال

rekhta

Scanned with CamScanner

ذی شان ساحل

کی نظموں کا مجموعہ

چڑیوں کا شور

قیمت: چالیس روپے

افضال احمد سیّد

کی نظموں کا مجموعہ

دو زبانوں میں سزائے موت

قیمت: پچاس روپے

آج کی کتابیں

تقسیم کار: مکتبۂ دانیال

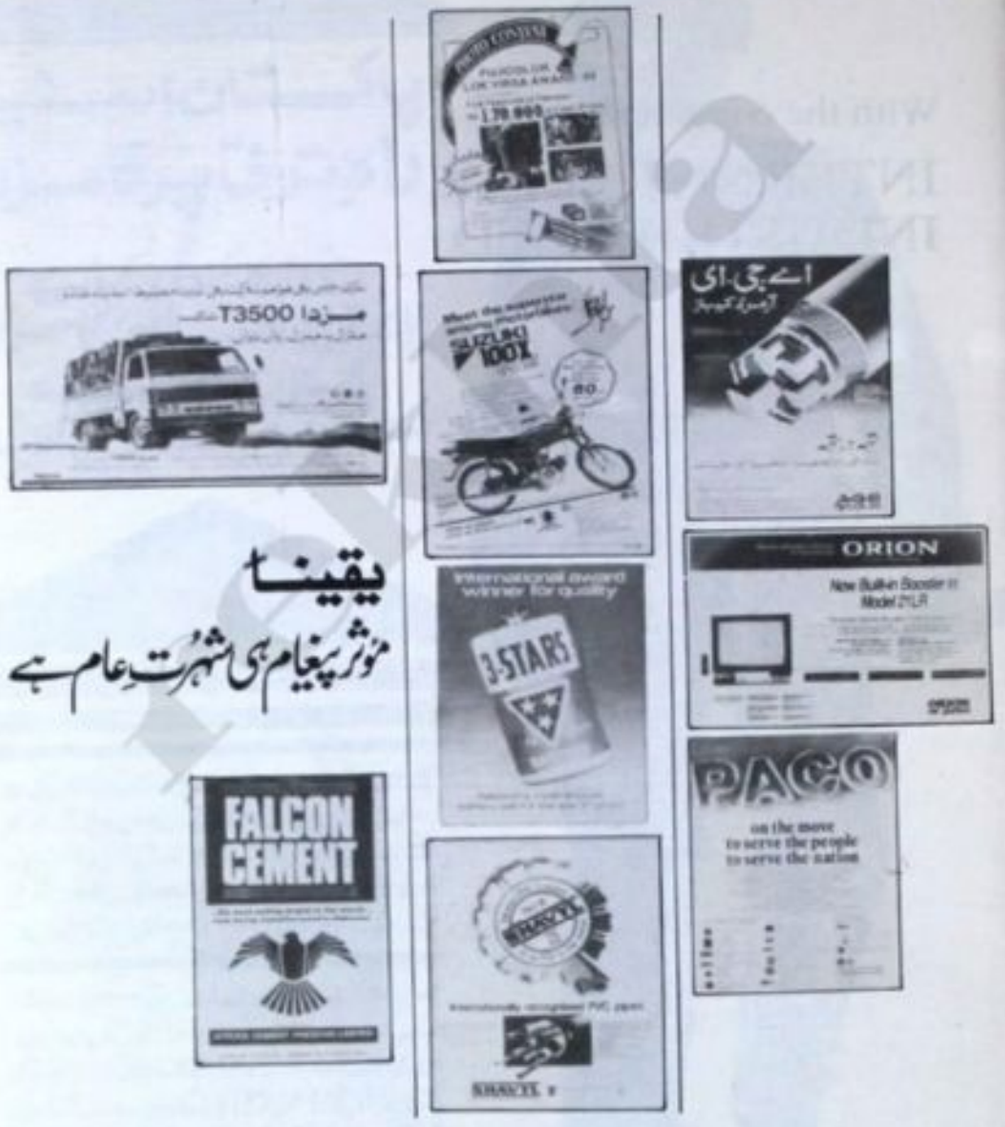

یقیناً
مؤثر پیغام ہی شہرتِ عام ہے

ARGUS ADVERTISING (PRIVATE) LTD

Scanned with CamScanner

پاکستان اسٹیل
راہِ ترقی پر گامزن

اجتماعی کارکردگی کے ذریعے
بلند ترین نصب العین کا حصول
پاکستان کے سب سے بڑے
صنعتی ادارے کا مطمح نظر ہے

پاکستان اسٹیل کی مصنوعات متعدد صنعتوں میں کامیابی سے استعمال ہو رہی ہیں۔ ان میں ہاٹ آرن پلیٹس، ایچ۔ آر۔ کوائلز اور شیٹس، سی آر کوائلز اور شیٹس، گیلوانائزڈ کوائلز اور شیٹس، فارمڈ سیکشنز اور چیکرڈ پلیٹس کے علاوہ کوک، کولتار، گرینو لیٹڈ سلیگ، بولڈر سلیگ اور امونیم سلفیٹ شامل ہیں۔

مصنوعات کی پیداوار اور فروخت میں مسلسل اضافہ جہاں پاکستان اسٹیل کے مستقبل کے لئے خوش آئند ہے وہاں اس کے انتھک اور بے لوث کارکنوں کے لئے انتہائی حوصلہ افزا بھی۔ پاکستان اسٹیل قومی صنعتی ترقی کا رفتار پیما ہے اور پاکستان کے اس عظیم ترین صنعتی ادارے کی کامیابی ملکی اقتصادی ترقی کے لئے ایک مہمیز کی حیثیت رکھتی ہے۔

پاکستان اسٹیل
قوم کی خدمت، قوم کی تعمیر

manhattan

With the compliments of

INTERNATIONAL
INDUSTRIES LTD

Manufacturers of:
Galvanised Pipes
Steel Tubes
Cold - rolled steel

and Electrical Contractors

Scanned with CamScanner

آج

بہار ۱۹۹۰

محمد عمر میمن

امین مالوف

جیک لنڈن

اوکتاویو پاز

وجے دان دیتھا

کہانیاں

محمد سلیم الرحمٰن

نامکمّل ناول کے اوراق

محمد انور خالد

زیبا الیاس

نظمیں

انتخاب

پولینڈ کے چار شاعر

تادیوش روزے وچ

زبگنیو ہربرٹ

الیگزانڈر واٹ اور

واسلاوا شمبورسکا

نظموں کا انتخاب

اور بہت سی متنوع تحریریں

مارچ ۱۹۹۰ میں شائع ہو گا

قیمت • پچیس روپے

آج کی کتابیں

بی ۳۰ سیکٹر ۱۱ بی نارتھ کراچی ٹاؤن شپ کراچی ۳۶

تقسیم کار

مکتبۂ دانیال

وکٹوریہ چیمبرز نمبر ۲ عبداللہ ہارون روڈ کراچی